ادارۂ فروغ اردو لاہور

بار اوّل   فروری ۱۹۴۶ء   قیمت ۴؍

ناشر
محمد طفیل مالک ادارہ فروغ اُردو
لاہور

مطبوعہ
پی-آر-بی-ایس پریس
لاہور

ترتیب

عرضِ ناشر

اس ادارہ کی طرف سے جبران کی یہ دوسری کتاب پیش کی جا رہی ہے اُردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ شام کے اس مشہور فلسفی کے افکار کو بعض مصنفین نے اُردو زبان میں پیش کیا۔ جبران جدید ادب کا دلدادہ تھا، وہ ہر چیز میں انقلاب کا خواہاں تھا۔ وہ ڈھکی چھپی باتوں کو برملا کہتا، مزدوروں کی بے بسی پر خود رونا اور دوسروں کو رُلانے پر قادر تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی بیکسوں کے آنسو پونچھنے اور سرمایہ داروں کی ریاکاری کو بے نقاب کرنے میں صرف کر دی۔ جبران اپنے ادبی اور تعمیری کارناموں کی وجہ سے زندہ ہے۔ زندہ رہے گا۔

میرے پیہم اصرار پر مولانا عبدالسبّوح صاحب نے جبران کے ان مضامین کا اُردو ترجمہ کیا اور یہ واقعہ ہے کہ انہیں بہت ہی زیادہ محنت کرنا پڑی۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے جبران کے خیالات کو پڑھا، سمجھا اور پھر لکھا ہے۔ اس لئے مجھے امیدِ کامل ہے کہ اس کتاب پر کہیں بھی ترجمہ کا گمان نہ ہو گا۔

یہ کتاب کیسی ہے اور اُردو ادب میں کیا مقام حاصل کرے گی اس کا فیصلہ قارئین کریں تو زیادہ مناسب ہو گا۔

محمد طفیل

احمد ندیم قاسمی کے نام

پیش لفظ

جبران خلیل جبران عربی۔ انگریزی اور فرانسیسی تینوں زبانوں کا ادیب تھا لیکن عربی ادب میں اسکو جو مقام حاصل ہے وہ صرف اسی کا حصہ ہے۔ عربی میں وہ اپنے جدید طرزِ تحریر اور انوکھے تخیل کا موجد تھا لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کی جتنی کتابیں اردو میں مختلف اداروں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں ان میں سے اکثر انگریزی سے ترجمہ ہیں پیشِ نظر مجموعہ اس لحاظ سے بھی زیادہ قابلِ توجہ ہے کہ اس کے تمام مضامین براہ راست عربی سے ترجمہ کیئے گئے ہیں۔

یہ کتاب کسی ایسی کتاب کا ترجمہ نہیں جو کتابی شکل میں موجود ہو بلکہ یہ مجموعہ جبران کے ایسے مضامین کا ترجمہ ہے جو موقع بہ موقع عربی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ عربی رسائل کی بے شمار فائلوں کو چھان کر ان مضامین کا انتخاب عمل میں لایا گیا ہے۔

یہ مضامین جبران کی دیگر تصانیف سے بالکل مختلف ہیں۔ جبران کی اکثر تصانیف اس کے فلسفیانہ خیالات کو پیش کرتی ہیں لیکن پیشِ نظر مجموعہ میں اکثر و بیشتر ایسے مضامین ہیں جو عربوں کی زندگی ان کی تعلیم اور ان کی ترقی پر بے لاگ تبصرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور چونکہ عرب اور ہندوستان براعظم ایشیا میں شامل ہونے کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات میں مشترک ہیں اس بنا پر جبران کے یہ مضامین ہندوستان کی حالت اور اس کی موجودہ سیاست سے بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

ان خصوصیات کے پیشِ نظر میں کہہ سکتا ہوں کہ جبران کی یہ کتاب اُردو دان طبقے کی نظر میں اس کے شاہکار کی حیثیت رکھے گی۔

میں آخر میں اپنے مشفق بھائی مولانا عبدالقدوس قاسمی اور محترم دوست ملک محمد اسلم خان کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود مسودے پر نظرِ ثانی کی زحمت گوارا فرمائی اور اپنے مفید مشوروں سے مالامال کیا

عبدالسبوح قاسمی (فاضل دیوبند)

زیارت کاکا صاحب
۲ جنوری ۱۹۶۰ء

اپنا اپنا دیس

تمہارا لبنان اَور ہے اور میرا لبنان اَور۔

تمہارا لبنان سراسر مشکلات اور میرا لبنان آرائش وجمال۔

تمہارا لبنان خود غرضی اور فساد سے بھرا ہوا لبنان ہے اور میرے لئے حسین خوابوں اور دلکش آرزوؤں سے بھرا ہوا لبنان۔

تمہارا لبنان ایک سیاسی گتھی ہے جس کو کھولنے میں زمانہ مصروفِ عمل ہے لیکن میرا لبنان وہ پہاڑیاں ہیں جو اپنی ہیبت وجمال کی وجہ سے آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش میں ہیں۔

تمہارا لبنان بین الاقوامی مشکل ہے جس کو زمانہ کی گردشیں اِدھر اُدھر پھینک رہی ہیں لیکن میرا لبنان صبح کی خاموش وادیاں ہیں جن کے پہلو میں بیلوں کی گھنٹیاں بجتی ہیں اور رہٹ کی بھٹی آوازیں کانوں میں پڑتی ہیں۔

تمہارا لبنان کشتی ہے ایک مغرب اور جنوب سے آکر بسنے والے انسانوں کی لیکن میرا لبنان ایک دعائے رحمت ہے جو ہر صبح کے وقت جبکہ چرواہے کھیتوں کی طرف جاتے ہیں اور ہر شام کو جب کہ کاشتکار کھیتوں سے واپس لوٹتے ہیں تو حرکت میں آتی اور آسمان کی بلندیوں تک پہنچتی ہے۔

تمہارا لبنان ایسی حکومت ہے جس کے امیروں کا کوئی شمار نہیں لیکن میرا لبنان وقار سے معمور ایک پہاڑ ہے جو سمندر اور میدانوں کے درمیان اپنی جگہ پر اس شاعر کی طرح ڈٹا ہوا ہے جو دنیا اور آخرت کے درمیان بیٹھا ہو۔

تمہارا لبنان ایک حیلہ ہے جس سے لومڑی بجو کے مقابلہ میں اور بجو سے بھیڑیئے کے مقابلہ میں کام لیا جاتا ہے۔ لیکن میرا لبنان وہ تصورات ہیں جن سے میرے کانوں میں چاندنی راتوں میں حسین کنواریوں کی راگنیاں کھلیانوں اور کشید گاہوں میں چھوٹی بچیوں کے گیت گونج رہے ہیں۔

تمہارا لبنان مذہب کے امیر اور فوج کے قائد کے درمیان شطرنج کی بازی ہے لیکن میرا لبنان ایک پاک عبادت گاہ ہے جب میری نگاہ ان پہیوں پر چلنے والی مدنیت سے اکتا جاتی ہے تو میں اپنی رُوح لے کر اس عبادتگاہ میں داخل ہوتا ہوں۔

تمہارا لبنان دو انسانوں کی دنیا ہے ایک وُہ انسان جو ٹیکس دیتا ہے اور دُوسرا وُہ جو ٹیکس لیتا ہے لیکن میرا لبنان ایک تنہا انسان ہے جو چادلوں کے سائے میں اپنی کلائی پر تکیہ لگائے بیٹھا ہے اور وُہ اللہ کی ذات اور سورج کی روشنی کے سوا ہر چیز سے بے پروا ہے۔

تمہارا لبنان بندرگاہیں ہیں، ڈاک ہے اور تجارت ہے لیکن میرا لبنان نام ہے ایک دُور رس فکر کا، بھڑکتے ہوئے جذبات کا اور ایک بلند پایہ جملے کا جو زمین فضا کے کان میں آہستہ سے کہتی ہے۔

تمہارا لبنان نام ہے ملازمت پیشہ لوگوں، گورنروں اور مختلف افسروں کی بھیڑ کا، لیکن میرا لبنان نام ہے شباب کی تیزی، پختہ عمری کے ارادے اور بڑھاپے کے فلسفے کا۔

تمہارا لبنان بے عمل جمعیتوں اور بیکار کانفرنسوں کا نام ہے لیکن میرا

لبنان روشن آگ کے ارد گرد محفلوں کا نام ہے ایسی راتوں میں جہاں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ اور سفید برف پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔

تمہارا لبنان مختلف فرقہ بندیاں اور پارٹی بازیاں ہے لیکن میرا لبنان اُن بے پروا معصوم بچوں کی جماعت کا نام ہے جو ٹیلوں پر چڑھتے ہیں۔ پانی کی ندیوں سے کھیلتے ہیں اور میدانوں میں گیند لڑھکاتے پھرتے ہیں۔

تمہارا لبنان لیکچروں، وعظوں اور مناظروں کا نام ہے لیکن میرا لبنان کبوتروں کی آوازیں، شاخوں کی سرسراہٹ اور نشیبی زمینوں اور پہاڑی غاروں میں بانسریوں کی صدائے بازگشت،

تمہارا لبنان مستعار ذکاوت کے پردے میں چھپے ہوئے جھوٹ اور تقلید و تصنع کی چادر میں لپٹی ہوئی ریا کا نام ہے لیکن میرا لبنان ایک کھلی ہوئی صاف حقیقت ——— جو پانی کے تالاب میں دیکھتی ہے تو اُسے اپنے پرسکون چہرے اور متناسب اعضا کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

تمہارا لبنان کاغذ کے اوراق پر لکھے ہوئے قوانین، دفتروں میں بند وعدوں اور عہد ناموں کا نام ہے لیکن میرا لبنان اُس فطرت کا نام ہے جو اسرار حیات سے واقف ہے۔ مگر واقفیت کے احساس سے لاعلم ہو

ہے۔ بہار سے کہار

اس شوق کا نام ہے جو بیداری میں غیب کے دامن سے چمٹا رہتا ہے اور خواب
میں اسے اپنا ہی وجود دکھائی دیتا ہے۔

تمہارا لبنان نام ہے اُس بوڑھے کا جو اپنی داڑھی کو پکڑے بیٹھا ہے
اُس کی پیشانی پر تیوری کے بل ہیں۔ اور جسے اپنے سوا کسی کی فکر نہیں لیکن میرا
لبنان نام ہے اُس جوان کا جو پہاڑ کی طرح سینہ تانے کھڑا ہے صبح کی طرح
مسکراتا ہے اور دوسروں کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہے جس سے وہ خود اپنے
آپ کو دیکھتا ہے۔

تمہارا لبنان کبھی شام سے کٹ جاتا ہے اور کبھی اس سے مل جاتا ہے
اور ہر وقت سرحدات کی قطع و برید میں مصروف رہتا ہے لیکن میرا لبنان
نہ کبھی کٹتا ہے نہ کبھی ملتا ہے نہ اپنے درجے سے بڑھتا ہے اور نہ گھٹتا ہے۔

تمہارا لبنان اور ہے اور میرا لبنان اور۔

تمہارا اپنا لبنان اور اپنے لبنانی فرزند ہیں اور میرے لئے میرا لبنان اور
اس کے فرزند!

آؤ بتاؤں تمہارے لبنانی فرزند کون ہیں؟ تھوڑی دیر کے لئے سوچو

میں ان کی حقیقت تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں۔

تمہارے لبنانی فرزند وہ ہیں جن کی روحیں مغرب کے ہسپتالوں میں پیدا ہوئیں اور جن کی ہوش اُن لالچی دائیوں کی آغوش میں بیدار ہوئی جو حریص ہوکر منصف مزاجی کا پارٹ ادا کرتی ہیں۔

تمہارے لبنان کے فرزندان نرم شاخوں کی طرح ہیں جو بغیر اپنے ارادے کے دائیں بائیں جھکتی رہتی ہیں اور جو صبح و شام مرتعش ہوتی ہیں لیکن ان کو اپنے ارتعاش کا علم نہیں ہوتا۔

وہ اس کشتی کی طرح ہیں جو موجوں کے تھپیڑوں سے سکان اور بادبان کے بغیر ٹکراتی ہے لیکن اس کی کوئی راہ متعین نہیں ہوتی۔

تم بڑے سخت ہو۔ نہایت فصیح و بلیغ ہو آپس میں ایک دوسرے کے مقابلہ پر۔ لیکن فرنگیوں کے سامنے کمزور اور گونگے۔

تم آزاد مصلح اور بہادر ہو لیکن صرف اپنی اسٹیجوں اور اخبارات میں اور مغرب کے باشندوں کے سامنے فرمانبردار اور رجعت پسند۔ وہی ہو تم جو مینڈکوں کی طرح اِدھر اُدھر ٹراتے پھرتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم نے اپنے قدیم سرکش دشمن سے نجات پائی حالانکہ تمہارا وہ سرکش دشمن ابھی تک تمہارے جسموں میں

پوشیدہ طور پر موجود ہے۔

تم وہی ہو جو جنازہ کے آگے آگے ناچتے اور گاتے چلتے ہو لیکن جب تمہیں سامنے سے کوئی برات آتی دکھائی دیتی ہے تو تمہارا گانا بجانا سوگ، اور تمہارا ناچ سینہ کوبی اور کپڑے پھاڑنے میں بدل جاتا ہے۔

تم وہی ہو جو بھوک سے اسی وقت واقف ہوتے ہو جب خود تمہاری جیبیں خالی ہوں مگر جب تم ایسے لوگوں سے ملتے ہو جن کی جانیں بھوک سے نکلی جا رہی ہوں تو تم ان پر ہنستے ہو اور منہ پھیر کر کہتے ہو "یہ صرف بناوٹ ہے"۔

تم ایسے غلام ہو کہ جب زمانہ تمہاری زنگ آلود بیڑیاں اتار کر چمکدار بیڑیاں پہنا دیتا ہے تو تم اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہو۔

یہی تمہارے لبنان کے فرزند ہیں تو مجھے بتاؤ کہ کیا ان میں ایسا بھی کوئی ہے جو لبنان کی گھاٹیوں میں مجسم عزم بن کر اٹھے اسکے نام کو بلند کرے اور اس کے پانی میں شیرینی پیدا کر دے یا اس کی ہوا میں خوشبو پھیلائے؟ کیا ان میں ایسا کوئی ہے جو یہ کہنے کی جرأت کر سکے کہ جب میں مرونگا تو لبنان اس دن سے بہتر حالت میں ہوگا جس دن میری پیدائش ہوئی تھی یا جو اس اعلان

کی جرأت کے قابل ہو کر میری زندگی لبنان کی رگوں میں ایک قطرۂ خون بن کر دوڑی یا اس کی پلکوں میں ایک آنسو کا قطرہ بن کر چمکی یا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر کھیلی۔

یہی تمہارے لبنان کے فرزند ہیں، تمہاری آنکھوں میں کتنی قدر و منزلت کے مالک، لیکن میری نگاہ میں بڑے ہی حقیر۔ اب ذرا ٹھیرو! میں اپنے لبنان کے فرزندوں کی تصویر تمہارے سامنے پیش کر دوں۔

میرے لبنان کے فرزند وُہ کسان ہیں جو غیر آباد زمینوں کو چمن اور باغات میں بدل دیتے ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وُہ چرواہے ہیں جو اپنے مویشیوں کے ریوڑ کو ایک وادی سے دُوسری وادی میں لئے پھرتے ہیں۔ جو بڑھتے، پھلتے پھولتے ہیں اور پھر بھی چرواہے ان کا گوشت تمہیں غذا کے لئے اور ان کی اُون پوشاک کے لئے مہیا کرتے ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وُہ باغبان ہیں جو انگور سے شراب کھینچتے ہیں اور شراب سے سرکہ بناتے ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وُہ ابنائے آدم ہیں جو شہتوت کے کیڑوں کی پرورش

کرتے ہیں اور وہ حوا کی بیٹیاں جو ریشم کاتتی ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وہ شوہر ہیں جو کھیتی باڑی کرتے ہیں اور وہ بیویاں ہیں جو زعفران اکٹھا کرتی ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند معمار، کمہار، جُلاہے اور ناقوس و جرس بنانے والے لوہار ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وہ دیہاتی شاعر ہیں جو ٹھمریاں اور گیت بناتے ہیں اور جو ہر روز اپنے دل کا خون نئے نئے پیالوں میں ڈال کر پیش کرتے رہتے ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وہ ہیں کہ جب وہ مادرِ وطن سے جُدا ہوتے ہیں تو ان کے دلوں میں شجاعت، بازوؤں میں قوّت کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور پھر ساری زمین کی نیکیاں اپنے ہاتھ میں اور دوسروں سے چھینے ہوئے تاج سر پر لے کر واپس لوٹتے ہیں۔

میرے لبنان کے فرزند وہی ہیں جو اپنے اردگرد کے ماحول پر ہر جگہ غالب آتے ہیں، جہاں بھی دیکھنے میں آتیں۔ لوگوں کے دل ان کی طرف کھچے چلے آتے ہیں وہ وہی ہیں کہ جن کی پیدائش جھونپڑیوں میں ہوئی ہے اور علم کے عالیشان

محلات میں آخری آرامگاہ بناتے ہیں۔

یہی وُہ چراغ ہیں جن کو زمانہ کی تند و تیز ہوائیں بجھا نہیں سکتیں یہی وُہ ذائقہ ہے جس کو زمانہ خراب نہیں کر سکتا۔

یہی ہیں وُہ جو پوری ثابت قدمی سے حقیقت، جمال اور عرُوج کی طرف بڑھتے ہیں۔

اب بتاؤ! کہ تمہارے لبنان کے فرزندوں میں سے ایک صدی کے بعد کیا باقی رہیگا؟

کل کے لئے تم جھوٹے دعووں اور بُزدلی کے سوا اور کیا چھوڑو گے؟

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ زمانہ دھوکے، فریب اور سُستی و کاہلی کے مظاہر کو اپنے حافظہ میں جگہ دیتا ہے؟

کیا تم سمجھتے ہو کہ غبار کے گریبان میں موت کی تصویریں اور قبروں کے نشان باقی رہتے ہیں؟

کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ زندگی اپنے ننگے جسم کو پھٹے کپڑوں سے ڈھانپنے کی بیکار کوشش کرتی ہے؟

میں سچائی کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ زیتون کا چھوٹا سا پودا جس کی ایک دیہاتی لبنان کی گھاٹیوں میں کاشت کرتا ہے تمہارے تمام اعمال اور ان کے نتائج سے زیادہ دیرپا ہے اور لکڑی سے بنا ہوا ہل کا پرزہ جسے کاشتکار لبنان کی وادیوں میں گھسیٹتا ہے، تمہاری تمام خوش آئند امیدوں اور جھوٹی آرزوؤں سے زیادہ بہتر ہے۔

حقیقت گواہ ہے کہ کھیتوں میں بہنے والی ندی کی آواز تمہارے گلا پھاڑ پھاڑ کر بولنے والے خطیب کی آواز سے زیادہ دیرپا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تم کسی کام کے نہیں ہو، اگر تم سمجھتے کہ تمہارا وجود بیکار ہے تو اس وقت میرے نفرت کے جذبات رحم اور مہربانی کے جذبات میں بدل جاتے۔ کاش میری آواز تمہاری روحوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کر دے۔

تمہارا لبنان اور ہے اور میرا لبنان اور۔

تمہارے لئے تمہارا لبنان اور اس کے فرزند ہیں بشرطیکہ تم پانی کے بلبلوں کو دیرپا سمجھ کر انہی پر قناعت کرسکو۔

لیکن میں اپنے لبنان اور اس کے فرزندوں پر قناعت کئے بیٹھا ہوں اور میری اس قناعت میں حلاوت، سکون اور اطمینان ہے۔

۹۰۰۸۱

تنہائی

حیات تنہائی کے سمندر میں گھرا ہوا ایک جزیرہ ہے۔

حیات ایک ایسا جزیرہ ہے۔ جو آرزو کے ٹیلوں، خواب کے درختوں، وحشت کے پھولوں اور پیاس کے چشموں سے مرکب ہے اور وہ تنہائی کے سمندر کے درمیان واقع ہے۔

بھائی حیات تمام ممالک اور جزائر سے کٹا ہوا ایک جزیرہ ہے چاہے تم جتنے جہاز اور کشتیاں چلا کر دوسرے کناروں پر لگا لو یا تمہارے جزیرے کے کنارے پر چاہے جتنے بحری بیڑے اور عمارات

کھڑی کر لی جاتی ہیں۔ اس کی تنہائی پھر بھی باقی رہتی ہے اس لئے کہ تم ہی اپنی مسرتوں کے تنہا مالک ہو، تمہارے نغمے کی آواز اوروں کے کانوں تک نہیں پہنچتی اور تمہارے اسرار اور بھیدوں سے تمام کائنات بے خبر ہے۔

بھائی! میں نے تمہیں دیکھا کہ تم سونے کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے اپنی ثروت کی خوشیوں میں مگن اور اپنی سرمایہ داری کی تعلیوں میں سرشار تھے۔ تم سمجھ رہے تھے کہ سونے کی ہر ڈلی نظر نہ آنے والی تار کے ذریعہ لوگوں کے افکار کو تمہارے خیالات سے ملاتی اور ان کے رجحانات کو تمہاری جانب جھکاتی ہے میں نے تمہیں دیکھا کہ تم ایک فاتح اعظم کی طرح اپنی سنہری (دولت کی) فوج کے ذریعہ مضبوط قلعوں پر حملہ کر کے انہیں توڑ کر رکھ دیتے ہو اور ناقابلِ تسخیر مستحکم مقامات کو اپنے دستِ تصرف میں لے آتے ہو لیکن جب میں نے دوبارہ گہری نظر سے دیکھا تو تمہارے خزائن کی دیواروں کے پیچھے تمہارا میں پھڑکتا ہوا ایک دل نظر آیا، جو اس پرندے کی مانند تھا جو سونے اور جواہرات کے قفس میں محبوس ہو اور پیاس سے تڑپ رہا ہے مگر اسے پانی کا ایک قطرہ میسر نہیں آتا۔

بھائی! میں نے تمہیں بزرگی کے تخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا لوگ تمہارے

اردگرد کھڑے تمہارے نام کی جے پکار رہے تھے تمہاری نیکیاں گنی جا رہی تھیں۔ تمہارے احساسات کو سراہا جا رہا تھا اور تمہاری طرف یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے گویا وہ کسی نبی کے دربار میں کھڑے ہیں اور ان کو یقین ہو کہ اس کی روح کے ساتھ اُن سب کی روحیں عالمِ بالا کی سیر کو اُڑ جائیں گی اور تمہاری نگاہوں میں قوت اور غلبہ کے آثار چمکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تم روح ہو اور وہ جسم ہیں لیکن جب میں نے تمہیں پھر دیکھا تو میں نے تمہاری تنہا ذات کو تمہارے تخت کے پاس ایک طرف کھڑا پایا۔ وہ اپنی اجنبیت کے درد سے کراہ رہی تھی۔ اور اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا کہ وہ اپنا ہاتھ ہر طرف بڑھا بڑھا کر رحم و کرم کی طالب ہے۔ پھر میں نے اسے دیکھا کہ وہ لوگوں کے سروں کے اُوپر سے کسی دُور مقام پر نظر ڈال رہی ہے۔ جہاں اس کی وحدت و انفراد کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

بھائی! میں نے تمہیں ایک حسین عورت کے ساتھ محبت کی باتوں میں مصروف پایا۔ تم اس کی پیشانی پر دل سے نکلے ہوئے خون کے قطرے بہا رہے تھے اور اپنے ہونٹوں سے اس کی نرم و نازک ہتھیلیوں پر لگاتار بوسے برسا رہے تھے اور

وہ محبت کی کرنوں سے چمکتی ہوئی آنکھیں تمہارے چہرے پر چھائے ہوئے تھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی میں نے یہ دیکھ کر اپنے دل میں کہا کہ محبت نے اس شخص کی تنہائی کو ختم کر دیا اور اب اس کی وحشت کے دن بیت گئے۔ یہ اب اس روح کل سے مل گیا ہے جس کے ساتھ ہجر و فراق کے ٹوٹے دل محبت کے واسطے سے جڑ جاتے ہیں لیکن جب میں نے پھر تمہاری جانب دیکھا تو تمہارے دل کے اندر لپٹا ہوا ایک اور بے چین دل نظر آیا جو اپنے بھیدوں کو اس حسینہ کے سر پا آنسو کی شکل میں بہانا چاہتا تھا لیکن بے بس تھا محبت سے پگھلتے ہوئے دل کے پار ایک اور دل نظر پڑا جو آسمان پر چھائے ہوئے دھند کی طرح تنہا نظر آرہا تھا وہ اس کوشش میں تھا کہ تمہاری محبوبہ کی ہتھیلیوں میں آنسو بن کر گرے لیکن وہ ایسا کرنے سے عاجز تھا۔

بھائی! یہ سچ ہے کہ تمہاری حیات تمام منازل اور تمام جانداروں سے الگ ایک منزل ہے تمہاری حقیقی زندگی ظاہری راستوں سے بہت دور اور تمہارے ظاہری جسم سے بالکل جدا ایک منزل ہے اگر تمہاری حقیقی منزل تاریک ہے تو تم اپنے اردگرد کے ماحول سے اسے روشن نہیں کر سکتے اگر

منزل خالی ہے تو اس ظاہری جسم کے محاسن سے تم اُسے بھر نہیں سکتے اگر یہ پودا کسی بیابان میں تنہا کھڑا ہے تو تم اسے اوروں کے لگائے ہوئے باغ میں منتقل نہیں کر سکتے اور اگر یہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر موجود ہے تو غیروں کے پاؤں سے روندی ہوئی زرخیز وادیوں میں اسے اُتار نہیں سکتے۔

تمہاری یہ زندگی وحدت و انفراد میں گھری ہوئی ہے۔ اگر یہ وحدت و انفراد نہ ہوتا تو میں اور تم الگ الگ ہوتے اگر یہ وحدت نہ ہوتی تو تم اپنی آواز سُن کر یہ سمجھتے کہ میں بول رہا ہوں اور اگر میں تمہارا چہرہ دیکھتا تو مجھے خیال آتا کہ میں اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھ رہا ہوں۔

دورِ جدید

مشرق میں دو مختلف نظریے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ فکرِ قدیم اور فکرِ جدید۔ اور یہ یقینی ہے کہ اپنے قویٰ کی کمزوری اور عزم کی بے ثباتی کی وجہ سے فکرِ قدیم مغلوب ہو گی۔

مشرق میں بیداری نیند سے مقابلہ کر رہی ہے اور بیداری فاتح بن کر رہے گی۔ اس لئے کہ سورج بیداری کا نقیب ہے اور صبح اس کی فوج کا کام دے رہی ہے۔

مشرق کل تک ایک خشک وسیع بیابان تھا لیکن آج سدا بہار بن کر قبروں میں مدفون انسانوں کو پکار پکار کر جگا رہا ہے اور ان کو زمانہ

کے ساتھ چلنے پر مجبور کر رہا ہے۔ جب یہ اپنے گیت گانے لگتا ہے تو سردی کا
مارا ہوا مُردہ کفن پھاڑ کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔

مشرق کی فضا میں زندگی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں جو بڑھ بڑھ کر
حساس نفوس کو اپنے ساتھ ملاتے ہیں اور مل کر بھاگنے والے قلوب کو اپنے
ساتھ ملانے کیلئے سرگرم عمل ہیں۔

آج مشرق کے دو سردار ہیں، ایک بوڑھا سردار جو احکام صادر کرتا
ہے بعض چیزوں سے لوگوں کو روکتا ہے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کی
جاتی ہے مگر خود وُہ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے پیر فرتوت کی مانند ہے۔ دوسرا سردار فطری
نوانین کی طرح خاموش اور حق کی طرح مطمئن ہے اور وقار سے دیکھ رہا ہے
لیکن وُہ آستین چڑھائے ہُوئے تیار کھڑا ہے، اس کا عزم اس کے چہرے
نمایاں ہے اس کو اپنی فہم و فراست پر پُورا اعتماد ہے۔

آج مشرق میں دو ہی انسان ہیں، کل کا انسان اور آج کا انسان
مشرق میں بسنے والے انسان! تُو بتا، تُو کونسا انسان ہے؟
میرے قریب آ۔ تاکہ میں تجھے غور سے دیکھوں تیرے دل کی گہرائیوں کا

جائزہ لوں تیرے ظاہری آثار سے اندازہ کروں کہ تو کیا ہے، روشنی کی
طرف بڑھنے والا یا تاریکی کی جانب گرنے والا!

آؤ! مجھے بتاؤ تم کون ہو اور کیا ہو؟

کیا تم وہ سیاسی لیڈر ہو جو دل میں منصوبے باندھ رہا ہو کہ اپنی قوم
سے ذاتی نفع حاصل کرے یا وہ غیور مجاہد ہو جو ہر وقت یہ ارادہ کر کے کام
کرتا ہے کہ قوم کی خاطر شہید ہو جائے؟

اگر تو پہلا ہے تو تو ایک خودرو اور بیکار پودا ہے اور اگر تو دوسرا ہے
تو پھر تو جنگل کا ایک ہرا بھرا کھیت ہے۔

کیا تم ایسے تاجر ہو جو لوگوں کے روزمرہ کام آنے والی چیزوں کو اس
نگاہ سے خریدتا ہے کہ ان کو اپنے پاس رکھ کر ضرورت کے وقت من مانی قیمت
وصول کرے؟ یا تو وہ انسان ہے جو اس کوشش میں لگا ہو کہ کاشتکار اور
جولاہے کے درمیان مال کے تبادلہ کے لئے آسانیاں فراہم کرے۔ محتاج اور
محتاج الیہ کے درمیان کڑی بن کر دونوں کو اور خود بھی دونوں سے انصاف سے
فائدہ حاصل کرے۔

اگر تو پہلا ہے تو تو مجرم ہے چاہے تو عالیشان کوٹھی میں رہے یا جیل کی

تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اور اگر دوسرا ہے تو پھر تو محسن ہے چاہے لوگ تمہارے شکر گذار ہوں یا نہ ہوں۔

کیا تو کوئی مذہبی رہنما ہے جو قوم کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے جُبّے اور عبائیں تیار کرتا ہے ان کی سادہ دلی سے اپنے سر پر رکھنے کے لئے تاج تیار کرتا ہے اور شیطان کی برائیوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے لیکن خود اسی کی خیرات پر عیش اڑاتا ہے ؟ یا تو وہ متقی اور پرہیز گار انسان ہے جسے فرد کی بہتری میں امت کی ترقی نظر آتی ہے اور اپنی روح کی گہرائیاں اسے روحِ کُل کی طرف چڑھنے کیلئے سیڑھی نظر آتی ہیں ؟

اگر تو پہلا ہے تو تو ملحد اور کافر ہے چاہے تو دن کو روزہ رکھے اور رات عبادت میں گذارے اور اگر تو دوسرا ہے تو پھر تو حق کے باغات میں خوشبودار کلی ہے۔ چاہے اس کی خوشبو لوگوں کے مشام تک پہنچ کر ضائع ہو جائے یا فضا میں اُڑ کر اور کلیوں کی خوشبودار مہک سے مل کر محفوظ ہو۔

کیا تو کوئی ایسا مضمون نگار ہے جو اپنا علم و فکر بازار میں بیچتا پھرتا ہے جو دنیا کے مصائب و آلام سے اخبار کی وجہ سے پھلتا اور پھولتا ہے اور گدھ کی طرح سڑی ہوئی مُردار لاشوں کے سوا کسی پر اس کی نظر نہیں پڑتی یا تمدن کے

منبروں میں سے ایک منبر پر کھڑا ہوا واعظ ہے جو زمانہ کے حالات سے خود نصیحت حاصل کرنیکے بعد لوگوں کو متنبہ کرتا ہے۔

اگر تُو پہلا ہے تو تُو انسانی جسم پر سڑی ہوئی پھنسی ہے اور اگر تو دُوسرا ہے تو پھر تُو نوعِ انسانی کیلئے تریاق کی دوا ہے۔

کیا تُو ایسا حاکم ہے جو اپنے سے اُونچے افسروں کے سامنے ذلیل اور اپنے ماتحت لوگوں کے سامنے مغرور ہو کر آتا ہے۔ وُہ اپنی ہر حرکت سے غریبوں کے مال پر ڈاکہ ڈالتا ہے وُہ کسی غریب کے ساتھ کوئی قدم ایسا نہیں اُٹھاتا جس میں اس کا اپنا ذاتی فائدہ نہ ہو؟ یا تُو قوم کا ایسا خادم ہے جو پوری دیانتداری سے ماتحت افراد کے انتظام میں لگا رہتا ہے۔ ان کی خیر خواہی میں راتوں کو جاگتا ہے اور ان کی آرزوؤں کی تکمیل کی انتہائی سعی کرتا رہتا ہے۔

اگر تُو پہلا ہے تو تُو قوم کے کھلیانوں میں کا نیرہ ہے اور اگر تُو دوسرا ہے تو پھر تُو ان کی خواہشات کے لئے برکتِ خداوندی ہے۔

کیا تُو وُہ شوہر ہے جو ایک ہی چیز کو اپنی بیوی کے لئے حرام اور اپنے لیے جائز سمجھتا ہے، جو آزادی سے جبتا پھرتا، خوشی میں اتراتا ہے اور بیوی کے جیلخانے کی چابی اپنی جیب میں لئے پھرتا ہے، جو جو میں آتا ہے کھاتا ہے اور

۲- اس کی بیوی ٹوٹی ہوئی کرسی پر تنہا بیٹھی رہتی ہے؟ یا تو وہ ساتھی ہے جو اپنی رفیقہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بغیر کوئی کام نہیں کرتا یا جو اس کے مشورے کے بغیر کوئی ارادہ نہیں کرتا اور اسے اپنی خوشیوں میں شریک کئے بغیر کوئی کام انجام کو پہنچنے نہیں دیتا۔

اگر تو پہلا ہے تو تو زمین دوز غاروں میں رہنے والی اور کھال کا لباس پہننے والی قوم میں سے ہے جو مدت ہوئی ختم ہوگئی اور اگر تو دوسرا ہے تو پھر تو اس قوم کا پیشرو ہے جو صبح کی روشنی کے ساتھ ساتھ عدالت اور انصاف کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔

کیا تو ایسا مضمون نگار اور نقاد ہے جو اپنے آپ کو ہم سب پر فوقیت دینے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس کے بوسیدہ افکار ماضی کے ان ناکارہ مراکز کا چکر لگاتے ہیں۔ جہاں اقوام کے پرانے چیتھڑوں اور ناکارآمد چیتھڑوں کا ڈھیر ہے

یا تو ایسی صحیح فکر کا مالک ہے جو اپنے ماحول کو ہر وقت اپنی نظر میں رکھتا ہے تاکہ مفید اور مضر اشیاء کو پہچانے اور اپنی عمر مفید اشیاء کی ترقی اور مضر اشیاء کی بیخ کنی میں صرف کرے۔

اگر تُو پہلا ہے تو پھر تُو فاسد خرابی ہے اور فضول کُند ذہنی اور اگر تُو دُوسرا ہے تو تُو بھوکوں اور پیاسوں کیلئے پانی کی مانند ہے۔

کیا تُو وُہ شاعر ہے جو امیروں کے دروازوں پر رباب بجاتا ہے۔ اور میلوں میں لفظوں کے پھُول بکھیرتا پھرتا ہے اور سڑی ہُوئی لاشوں کے پیچھے پیچھے مُنہ میں نیم گرم پانی کا بھرا ہُوا اسفنج لئے پھرتا ہے جیسے مقبرہ میں پہنچ کر زبان اور ہونٹوں سے دبایا جاتا ہے۔ یا وُہ فطری شاعر ہے جس کے ہاتھ میں سازِ فطرت ہے جس کے تاروں سے ربّانی نغمے نکلتے ہیں۔ کہ ہمارے دل بیساختہ اُن کی طرف کھچے چلے جاتے ہیں اور جو ہمیں زندگی کے سامنے اور زندگی میں پیش آنے والے جمال اور خوف کے سامنے متحیّر کھڑا کر دیتے ہیں۔

اگر تُو پہلا ہے تو تُو ان شعبدہ بازوں میں سے ہے جو ہمارے دلوں میں کسی جذبہ کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ اگر وُہ روئیں تو ہم ہنستے ہیں اگر وُہ خوش ہوں تو ہم غمگین ہو جاتے ہیں۔ اور اگر تُو دوسرا ہے تو تُو ہماری ظاہری آنکھوں کے پیچھے سے شعاعیں پھینکنے والی بصیرت، ہمارے قلوب میں سمایا ہُوا شیریں شوق اور ہمارے جسموں سے دُور خدائی خواب ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مشرق میں دو جلوس ہیں۔ ایک بوڑھے کوزہ پشتوں کا جلوس جو ٹیڑھی لاٹھیوں کا سہارا لیتے ہوئے چلتے ہیں اور اس کے باوجود اُوپر سے نیچے کی طرف لڑھکتے جا رہے ہیں اور ہانپ رہے ہیں۔ دُوسرا جلوس ان جوانوں کا ہے جو تیزی سے بُلندی کی طرف بڑھ رہے ہیں گویا کہ ان کے پاؤں میں پَر لگے ہُوئے ہیں۔ وُہ یوں زور زور سے پکارتے ہیں گویا کہ ان کے گلے میں تار ہیں۔ وُہ گھاٹیوں کو یوں پھاندتے جا رہے ہیں جیسے کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر کوئی قوت ان کو کھینچ رہی ہے یا کوئی جادو ہے جو ان کی عقل کو سلب کر رہا ہے۔

اے مشرق کے رہنے والو! تم کس جلوس میں ہو اور کن کے ساتھ چل رہے ہو؟

اپنے نفس سے پوچھو۔ رات کی سکون پرور فضا میں جب ماحول کے اثرات زائل ہو چکے ہوں۔ اس سے جواب طلب کرو تم کل غلام بننا چاہتے ہو یا آزاد؟

میں تم سے کہتا ہوں کہ کل کے خواب دیکھنے والے اُس زمانہ کے جنازہ کے پیچھے جا رہے ہیں جس نے ان کو پیدا کیا اور جسے انہوں نے پیدا کیا۔ وُہ ایسی رسّی کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کے ہر سرے دھاگے کو زمانہ

نے بوسیدہ کر رکھا ہے اور عنقریب وہ رسی ٹوٹنے والی ہے۔ جب بھی وہ ٹوٹیگی
اُسی وقت اس کو تھام کر چلنے والے نسیان کے گہرے گڑھے میں دفن ہونگے
یہ لوگ ایسے مکان میں رہتے ہیں جس کے ستون گرنے والے ہیں جب بھی کوئی تیز
آندھی چلے گی ــــ اور بہت جلد چلیگی ــــ تو یہی مکان ان کے اوپر گریگے
اور ان کی قبروں کا کام دینگے۔ میں کہتا ہوں کہ ان کے اقوال، تنازعات،
تصانیف، دیوان اور ان کے تمام اعمال بھاری زنجیریں ہیں جو اپنے بوجھ کی
وجہ سے ان کو اپنے پیچھے پیچھے گھسیٹے پھرتے ہیں اور یہ لوگ اپنی کمزوری کی وجہ سے
ان کو اپنے پیچھے کھینچنے سے قاصر ہیں۔

لیکن کل کے فرزند وہ ہیں کہ جب زمانہ نے ان کو پکارا تو وہ ثابت قدمی
سے اپنا سرِ افتخار بلند کرکے پیچھے چل پڑے۔ یہی زمانۂ جدید کے لئے صبح کی مثال
ہیں۔ نہ دھواں ان کی روشنی کو روک سکتا ہے، نہ زنجیروں کی جھنکار ان کی آواز کو
کو روکنے کی قدرت رکھتی ہے اور نہ مدت کے ایستادہ پانی کی بدبو ان کی خوشبو اور
مہک پر غالب آ سکتی ہے۔ وہ بڑی تعداد کی بلیشمار جماعتوں میں گھری ہوئی محدود
افراد کی جماعت ہے لیکن سرسبز شاخ میں وہ سب کچھ ہے جو خشک جنگل میں
نہیں۔ اور گیہوں کے ایک خوشے میں وہ سب کچھ پایا جاتا ہے جو نیلیوں کے ڈھیر

نہیں پانا مشکل ہے۔ وہ نامعلوم جماعت ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ وہ پہاڑ کی بلند چوٹیوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں ایک دوسرے کی آواز سنتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں لیکن گہرے گڑھے اندھے ہوا کرتے ہیں جو کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتے اور بہرے ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی کی آواز سنا کرتے ہیں۔ وہ کھجور کی اس گٹھلی کے مانند ہیں جو اللہ کی طرف سے زمین پر گری، ایک نئی شان سے سربلند ہونے کی خاطر اپنا چھلکا پھاڑ کر نکلی اور سورج کے سامنے سرسبز و شاداب بن کر کھڑی ہو گئی اور عنقریب وہ ایک ایسا تناور درخت بن کر رہیگی جس کی جڑیں زمین کے حلق سے اتری ہوئی ہونگی اور جس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہونگی۔

میری حقیقت

جسمانی زندگی کے اِس قیدخانہ میں آنے سے پہلے ہم کہاں تھے اور کیا تھے؟

یہ مجرد، حسّاس اور جسموں میں برقرار روحیں، ہمارے جسموں میں قامت سے پہلے کہاں تھیں اور کیا تھیں؟

اس سے قبل کہ زمانہ ہمیں بے معنی آوازِ بنا کر دنیا میں لایا، ہم کیسی اطمینان کی جگہ سانس لے رہے تھے؟

ہمارے نفوس ان اشکال میں بدلنے سے قبل کس حالت

بھی تھے؟

خوابوں کی دنیا میں بولتی ہوئی یہ بیداری، خیالات سے آراستہ غور و فکر، یہ خوشی اور غم، محبت اور نفرت کے دھاگوں سے بندھی ہوئی آرزوئیں ماؤں کے بطن سے پیدا ہوئیں یا اثیر کی فضا میں۔

کیا اس سے پہلے کہ ذوقِ نمو ہمیں زندگی کی گود میں لے آیا ہم کچھ نہ تھے؟

ہوش سنبھالتے ہی میں نے یہ سوالات اپنے نفس سے پوچھے۔ میرے نفس نے ان سوالات کے جواب ایسے مبہم کلمات کی شکل میں دیئے جو میری سمجھ سے بالاتر ہوئے۔ میرا تفکر ان کلمات کو ایک گہری خاموشی کی طرف لے گیا۔ (جس طرح برف کے ٹکڑے پانی میں گر کر پانی ہو جاتے ہیں)

کل ایک نیا واقعہ میرے سامنے آیا جو قریب تھا کہ غیب کے اسرار مجھ پر کھول دیتا اور وجود کے بھیدوں سے مجھے آگاہ کر دیتا۔ یہ واقعہ میری خیالی دنیا کو اس زمانہ کے قریب لے گیا جب میرے ظاہری جسم کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو اپنے نفس کے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔ اس کے الفاظ سے میں اس قدر مسحور ہوا کہ میرے محدود فکر

اور کم عقلی کے درمیان ایک باریک رشتہ استوار ہونے لگا۔

میں نے سلیم نجومی کو دیکھا جو خود اپنی تعریف آپ کر رہا تھا۔ وہ ماضی بعید کے اُن واقعات کو بیان کر رہا تھا جو اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔ مجھے یقین آگیا کہ میں ایک ایسے انسان کے حضور میں کھڑا ہوں جو اور انسانوں سے مختلف ہے۔ وہ ایسی نازک اور باریک باتوں کو سمجھتا ہے جن کی تہ تک اوروں کی عقل کی رسائی نہیں اور ایسی باتیں یاد رکھتا ہے جن کی یاد اوروں کے ذہن سے مٹ چکی ہے۔

میں سلیم نجومی کو اٹھارہ برس سے جانتا تھا۔ ہم نے اس کا نام "مجذوب" رکھا تھا اس لئے کہ وہ جب بھی ہم میں سے کسی کو دیکھتا تو ایسی نظروں سے گھورتا جن سے تحیّر و تعجّب ٹپکتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اس سے قبل ہمیں کبھی نہیں دیکھا۔ اگر ہم کبھی اس کا نام لے کر اسے بلاتے تو وہ تین چار بار بلانے سے قبل ہمیں جواب نہ دیتا۔ اگر ہم کبھی اس سے کچھ پوچھتے تو پھٹی ہوئی آنکھوں سے ہمیں دیکھتا، سر ہلاتا اور یوں معلوم ہوتا کہ گویا ہم اسے کسی ایسی زبان میں مخاطب کر رہے ہیں جس کا کوئی لفظ عمر بھر میں اس کے کانوں نے نہیں سُنا۔ اور کبھی کبھی وہ نہایت دھیمی آواز اور معمولی حرکت سے بھی یکدم گھبرا اٹھتا جس طرح

کوئی سویا ہوا بندوق کی آواز سُن کر چونک اُٹھے۔ اگر وُہ بیٹھا ہوتا تو یکدم کھڑا ہو جاتا اور اگر کھڑے کھڑے آواز اس کے کان میں پڑتی تو بھاگنا شروع کر دیتا لیکن اس طرح کھوئے رہنے کے باوجود وُہ حد درجے کا زیرک تھا۔ اور بعض چیزوں میں تو اس کا فکر نہایت دُور رس تھا علم موسیقی اور علم ہیئت میں اس کو کمال حاصل تھا۔

میں نے جب بھی اسے عربی کی شعروں عربی کے اوزان اور اس کے معانی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سُنا تو اس کی نکتہ شناسی اور دقّت نظر دیکھ کر متعجب ہوا اسی طرح جس موقع پر بھی میں نے اسے موجودات کے حقائق اور گذرے ہوئے زمانے کے متعلق بحث کرتے دیکھا تو میں نے یہ تصوّر کیا کہ میں کسی ماہر ہیئت دان کی محفل میں بیٹھا ہوں میں دل میں سوچتا کہ اس کھوئے ہوئے مجذوب کی رُوح میں وُہ اسرار پوشیدہ ہیں جن تک اوروں کی ارواح کی رسائی نہیں اور اس کی مدہوشی میں ایسی بیداری پنہاں ہے جس کی خبر دنیا کے ہوشمند اور خبردار انسانوں کو نہیں۔

سلیم بخومی میں ایک اور عجیب بات یہ نظر آئی کہ وُہ گھنٹوں تک سورج کی طرف آنکھیں کھولے دیکھتا رہتا۔ اُس وقت دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا

کہ اس کی آنکھیں شیشے کی بنی ہوئی ہیں۔ نہ اس کی پلکیں جھپکتیں اور نہ اسکی آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ میں نے اُسے اس عادت سے روکنے کی کوشش کی اور اسے ڈرایا کہ ایسا کرنے سے تیری آنکھوں کی بینائی جاتی رہیگی لیکن اس نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ اُلو دن کے اوقات زمین کی تاریک جگہوں میں گذارتا ہے اور گدھ وہی وقت سورج کو دیکھتے ہوئے گذارتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کیا تو نے کبھی کسی گدھ کو اندھا دیکھا ہے"؟

شاید

تین سال گذر گئے۔ ہم نے سلیم کو نہیں دیکھا۔ میں اور میرے ساتھی کبھی کبھی اس کی عجیب و غریب حرکات کو یاد کر کے ہنستے تھے۔ اور کبھی اس کی ذہنی تہمت معدومات پر تبصرہ کر کے اپنی علمیت کو بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم نے لوگوں سے اس کے متعلق بہت پوچھا لیکن کوئی بھی ایسا نہ ملا جو اس کے متعلق کچھ جانتا ہو۔

ایک ہفتہ ہوا میں تنہا بیٹھا تو ایا نے نیم شبی کی طرف کان لگائے سُنتے اور ان کے اسرار معلوم کرنے میں محو تھا کہ میرے کانوں میں کواڑ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا تو سلیم کو سامنے کھڑا پایا۔ دُد

پھٹے کپڑے پہنے ہوئے تھا اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور اس کی پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ مَیں اس کی اچانک آمد سے بہت زیادہ مسرور ہوا۔ اسے اندر لایا۔ لیکن فقر و فاقہ کی علامات دیکھ کر مجھے کچھ تعجّب ہو رہا تھا۔ مَیں نے اسے اپنے سامنے بٹھایا اور اس کے حالات دریافت کرنے لگا۔ اور جو عرصہ اس نے گھر اور اہل و عیال سے دُور رہ کر گذارا تھا۔ اُس کے واقعات پوچھنے لگا۔ وُہ اپنی اُسی پُرانی عادت کے مطابق کبھی تو میری آواز سے یکدم چونک اُٹھتا اور کبھی بغیر کسی جواب کے میری طرف گھُور گھُور کر دیکھتا جیسے کہ وُہ کچھ بھی نہ سمجھتا ہو۔

مَیں نے اسے شراب کا ایک پیالہ پلایا اور اس کو بتایا کہ میرے دل میں اس کی کتنی محبت ہے اور میں اسے کتنا آرام میں دیکھنا چاہتا ہُوں پھر مَیں نے پوچھا "سلیم! تجھ پر کیا گذری تجھے اپنے باپ سے ورثہ میں کتنی جائداد ملی اور کتنا کثیر مال ملا لیکن تُو نے وُہ سب کچھ ضائع کر دیا۔"

کُرسی کے قریب رکھتے ہُوئے بجلی کے بلب کی طرف ٹکٹکی لگائے ہُوئے میرے سوال کا جواب اس نے یوں دیا "تعجب ہے کہ تم مجھ سے کیوں اس قسم کے سوالات کرتے ہو؟ نہ مَیں نے کوئی مال ضائع کیا اور نہ ہی کوئی

جائداد مجھے تو باپ سے جو کچھ ملا وہ اسی طرح باقی ہے" پھر مسکراتے ہوئے کہا۔" مجھے کل وکیلوں اور صرافوں نے بتایا کہ میرے والد کے مرتے ہی میری دولت دوگنی ہو گئی۔"

مَیں نے اُس کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مذاقاً کہا۔" اچھا تو تُو اس لباس سے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اگر لوگ تجھے دیکھیں تو اُن فقیروں میں سے سمجھیں جو لمبے لمبے عصاؤں کا سہارا لئے بغل میں لکڑی کا بنا ہوا کشکول دبائے شہر بہ شہر پھرتے ہیں۔"

اس نے جواب دیا۔" لوگوں میں تو ایسا کوئی بھی نہیں جو بھیس بدل کر اپنے آپ کو دنیا کی نظروں سے چھپانے کی کوشش نہ کر رہا ہو اور ان میں ایسا بھی کوئی نہیں جو کوئی نہ کوئی چیز مانگتا نہ پھرتا ہو۔"

مجھے اس کی بات بہت پسند آئی اور کہا۔" ٹھیک ہے لیکن تُو ایک معزز خاندان کا لال ہے کم از کم اپنے خاندان کی عزت کا تو خیال رکھ۔ اور ایسے لباس میں لوگوں کے سامنے آ جو تیرے اور تیرے خاندان کے شایانِ شان ہو۔"

وہ دھیمی آواز سے بولا۔" بھائی مَیں بہت زیادہ مصروف تھا اور ان

اُمور پر غور کرنے کیلئے میرے پاس کوئی وقت نہ تھا۔ میں ایک ایسے اہم کام میں لگا ہوا تھا جس کے سامنے عُمدہ لباس اور اچھے خورد و نوش کے سامان کی مطلق وقعت نہ تھی۔"

اس وقت اس کے چہرے سے گہری سوچ کے آثار دکھائی دینے لگے لیکن اس کے باوجود اس کی نظریں بجلی کے قمقمے ہی پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے پُوچھا "سلیم تو کس کام میں اتنا مصروف تھا۔ آخر وہ کونسا ایسا کام ہے جس کیلئے تُو نے باقی تمام دُنیا کو خیرباد کہا"؟

وُہ میری طرف متوجہ ہُوا اور کہا "میں اپنے حافظے کے پردوں کو پھاڑنے میں مصروف تھا۔ میں اپنے حافظے میں مدفون خزانوں کو کھود کر نکالنے میں محو تھا۔ میں زمانے کی کتاب کے ان اوراق کو ایک ایک کرکے اُلٹ رہا تھا جس کا نام تم نے حافظہ رکھا ہے۔"

اس کی زبان سے یہ کلمات اس طرح نکلے جس طرح خالی بیابان میں دُور سے قافلے کے جرس کی آواز کانوں میں پڑے۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں مجھ سے پھیر لیں۔ وُہ پھر بجلی کی روشنی کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اپنی زندگی میں جب میں نے اسے دیکھا تھا، مجھے یُوں محسوس ہوا کہ اس کی

پابندروح کے تار ذرا ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کا اندرونی اضطراب
بتدریج اطمینان کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ میں نے دوبارہ اس کے لئے شراب
کا پیالہ بھرا اور پھر اس سے پوچھا "سلیم حافظ کے مدفون خزانوں سے اور
زمانے کی کتاب سے جس کو ہم حافظ کہتے ہیں، تیری مراد کیا ہے؟ یہ جدید اور
عجیب خیال آخر ہے کیا؟"

اس نے جواب دیا "میں نہیں جانتا کہ تو مجھے کہاں تک سمجھ سکتا ہے
یا کس حد تک مجھے سمجھنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ میں خواہ مخواہ فضول ایسے
لوگوں کے سامنے اپنی دلی کیفیات بیان کرنے لگ جاتا ہوں جو روحانی دنیا
سے منہ پھیرے بیٹھے ہیں۔ میں بیکار اپنی ذات کو ایسے لوگوں کے سامنے کھول
کر بیان کرنے لگ جاتا ہوں جو اپنی ذات کو بھی نہیں پہچانتے"

میں نے کہا "سلیم! میں تجھے سمجھنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور اگر میں نے
دیکھا کہ میں تجھے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اپنی کم مائیگی کا اعتراف
کرونگا۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر شراب کا ایک گھونٹ پی کر کہنے لگا
"اچھا تو سنو، لیکن دل کے کانوں سے سنو! تم نے کبھی یہ بھی

سوچا ہے کہ تم اپنی پیدائش سے پہلے کس حالت میں تھے"؟

میری رُوح اس سوال سے لرز اُٹھی اور مَیں نے جواب دیا "ہاں امیر نے کئی مرتبہ اس مسئلہ پر غور کیا ہے لیکن ہر مرتبہ میری حالت اُس شخص کی طرح ہوتی تھی جو پرانے شاہ بلوط کے درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کا ارادہ کرکے اسے ہاتھ لگائے"۔

اُس نے کہا"۔ کیا تُو نے کبھی دکھائی دینے والی چیزوں سے آنکھیں بند کیں؟ دنیا کی آوازیں سُننے سے کانوں کو بند کرنے کی کوشش کی؟ زندگی کی سطحی چیزوں سے اپنے جی اس کو خالی رکھا؟ ایسا کرنے سے اُس حالت کو یاد کیا جا سکتا ہے جو ہمارے انسان بننے سے پہلے تھی"۔

مَیں نے کہا"۔ نہیں! ایسا میں کبھی نہ کر سکا"۔

اُس نے کہا"۔ مَیں نے ایسا کیا ہے۔ مَیں اپنی ذات کی گہرائیاں معلوم کرنے کی خاطر لوگوں سے دُور جا کر بیٹھا ہوں مَیں نے ایسی حالت میں اپنے حافظے کی قوت سے اپنی بصیرت کے سامنے اُس وقت کے نشانات کھول کر رکھے جب مجھے فرشتے زمین پر نہیں لائے تھے"۔

مَیں نے کہا"۔ اور کیا تو اپنی مُراد تک رسائی حاصل کر سکا؟ کیا تُو نے

اپنے حافظے پر اس وجود سے پہلے وجود کے آثار پا لئے ؟"

اُس نے کہا۔ "ہاں ! میں نے اپنی مُراد کو پا لیا۔ حافظہ زمانوں کی امانت گاہ ہے۔ ہمارا ہر ایک فرد اس بات پر قادر ہے کہ وُہ اس امانت گاہ میں گھُس کر اس کے گوشوں میں اور اس کی گہرائیوں میں زمانوں کے مدفون خزانوں کو دیکھے۔"

حافظہ ایک درخت ہے جس کے بیشمار پتّے ہیں اور ہم دائمی فکر اور اپنے آپ کو رُوح کے سُپرد کرنے کے ذریعے سے اس بات پر قادر ہو سکتے ہیں کہ ان اوراق کے گرد مسلسل چکر لگائیں اور بالآخر یہ اوراق ہماری نظروفکر کے سامنے اس طرح کھُل جائیں جس طرح سورج کی شعاعیں غنچے کے اندر پھول کی بند پنکھڑیوں تک پہنچتی ہیں اور غنچہ اُن حرارت کی وجہ سے کھِل کر پھُول بن جاتا ہے۔"

وُہ تھوڑی دیر کیلئے خاموش رہا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو اس کی مسرت کی آئینہ دار تھی۔ اور پھر کہنے لگا۔ "تم کئی سالوں سے مجھے مجذوب کہہ کر پکارتے رہے۔ تم میری حقیقت کی ترجمانی کر رہے تھے اور میری واقعی اصلی حالت بیان کر رہے تھے۔ مَیں ہمیشہ اس ظاہری شکل و نمود کی نام نہاد دُنیا میں بھٹکتا رہا۔ دُنیا میں ایسا کون ہے۔ جس کی حیاتِ معنوی

دو حصوں میں منقسم ہو۔ ایک حصے سے وہ عالمِ غیب کے حالات معلوم کرے اور
دوسرے حصے سے مادی دُنیا کے جھمیلوں میں پھنسے اور پھر وہ کھویا ہوا نہ رہے؟
کون ایسا انسان ہے کہ جب دو جذبے اس کی رُوح کو بیک وقت اپنی اپنی
طرف کھینچیں ـــــ پوشیدہ جذبہ اور ظاہری جذبہ ـــــ اور پھر وہ آہ آہ نہ
کرے! کون ایسا انسان ہے جو اپنے کانوں میں دو مختلف آوازوں کو جگہ
دے جن میں سے ایک آواز ـــــ فضائے آسمانی سے آتی ہوئی آواز ـــــ
اس کی رُوح کو مسرور رکھنے کی کوشش کرتی ہو اور دوسری آواز ـــــ زمین
کے اندر سے نکلتی ہوئی آواز ـــــ اسے نفرت دلاتی رہتی ہو! ـــــ ہاں
میں مجذوب تھا اور مجذوب رہا لیکن اس وقت میں وہ کچھ جانتا ہوں جو میں اپنے
عالمِ شباب میں نہیں جانتا تھا۔ میں تین سال تک اپنے حافظ کی کھیتی میں پھرتا
رہا اور میں نے سب کچھ حفظ کر لیا۔ میں نے معلوم کر لیا کہ اس وجود سے پہلے میں
کیا تھا۔ میں نے جان لیا کہ اس وجود سے پہلے میں کیسے تھا۔ میں نے معلوم کر لیا
کہ ماں کے پیٹ سے نکلنے سے قبل میری نفسی حالت کیا تھی۔ مجھ پر ظاہر ہو گیا
کہ میری رُوح کی حقیقت موجودہ جسم کا غلاف اوڑھنے سے پہلے کیا تھی۔ میں نے
اپنے سرچشمے کو پا لیا اور اب میں مطمئن ہوں۔ اس لیے کہ اسی حلقے میں وہ بھی

مرجع کو بتائے گا"۔

اس نے اپنا سر جھکا کر آنکھیں بند کرلیں اس کا کمزور چہرہ کسی ماہر سنگ تراش کا بنایا ہوا ہاتھی دانت کا ماڈل نظر آنے لگا جو نصرانیت کے شہدا میں سے کسی شہید کے چہرہ کی یاد دلانے کے لئے تراشا گیا ہو۔ میں اس کی کرسی کے قریب گیا اور اس خیال سے کہ میری آواز سے اس کے خیالات کا تسلسل نہ ٹوٹ جائے میں نے نہایت دھیمی آواز سے اسے مخاطب کر کے کہا "سلیم! خدا کیلئے مجھے وہ سب کچھ بتا دے جو تو نے حاصل کیا ہے۔ میں پوری توجہ سے تیرا ایک ایک لفظ سن رہا ہوں"۔

اس نے سر اٹھایا اور آنکھیں کھولے بغیر ہی اس نے جواب دیا۔ "یاد رکھو کہ میں فضا میں اڑ رہا تھا۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ میں خلا میں پرواز کر رہا تھا میں کبھی بلندی کی طرف چڑھتا تھا اور کبھی نیچے اترتا تھا۔ میں کبھی ہوا کے ساتھ دوڑتا اور اگر چاہتا تو ٹھہر جاتا تھا لیکن اپنے متعلق یہی سمجھتا تھا کہ میں ایک وقت میں ہر جگہ ہوں اور تمام اوقات میں ایک مقام پر ہوں۔ میں سورج کی کرنوں میں تنہا ہی نہیں بلکہ میں خود ان کرنوں میں سے ایک کرن کی حیثیت رکھتا تھا —— میں نہیں جانتا کہ میں اڑتے ہوئے غبار کا ایک ذرہ تھا کہ

غبار کا مجموعہ' میں نہیں جانتا کہ میں زندگی کے میلانات کا ایک
جُز تھا یا زندگی کے تمام میلانات کا سرچشمہ تھا —— میں اپنے متعلق کہتا کہ میں
میں ہوں" لیکن اس وقت "میں" کے لفظ سے مُراد یہ جسم نہ تھا جو صرف چند خطوط
میں گھرا ہوا ہے وہ ایک خاص رنگ رکھتا ہے اور اس کی کچھ خصوصی علامات
ہیں —— نہیں —— میں ایک فرد نہ تھا۔ میں ایک ذرّہ نہ تھا۔ میں ایک جزو
نہ تھا۔ نہ ہی میں چاروں عناصر میں سے کوئی ایک خاص عنصر تھا۔ بلکہ میں تو تمام
عناصر کا ایک مجموعہ تھا۔ جو مل کر ایک فرد کی حیثیت میں ظاہر ہو رہے تھے۔ میں
اس کی تعریف اس کے علاوہ کسی اور طرح کرنے کے قابل نہیں کہ میں ہی میں
تھا —— میں اپنے ماضی میں بھی تھا —— میں نے ماضی کا لفظ کہہ تو دیا مگر
میں اس کے مکمل معنی اب بھی نہیں سمجھتا —— کبھی ماضی حال اور استقبال
کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے اور کبھی تو ماضی حال اور استقبال کچھ بھی نہیں
پایا جاتا —— حقیقت یہ ہے کہ ہم جسے زمانہ کہتے ہیں میں اس کو سمجھ ہی نہ سکا۔
اور اسی طرح میں مکان کا مطلب سمجھنے سے بھی قاصر ہوں —— جب میں
ان دونوں لفظوں —— زمان و مکان —— کے متعلق دریافت کرنے لگتا ہوں
تو میں بڑی مشکل میں اپنے آپ کو پاتا ہوں۔ یہاں تک کہ خود اپنی ذات کا

علم مجھے نہیں ہوتا۔ میری عقل اس وقت ایک کثیف دھند کی صورت اختیار
کرلیتی ہے جو ٹیلوں اور گھاٹیوں میں بھٹکتی پھرتی ہے —— لیکن جہاں تک
میں اچھی طرح سمجھا ہوں وہ یہی ہے کہ ہم ایک حالت میں تھے اور پھر دوسری
حالت میں آگئے۔ میں معزز تھا ذلیل ہوگیا۔ میرے اندر وسعت تھی تو ایک
محدود دائرے میں گھر گئی۔ میری ابتدا و انتہا کی کوئی حد نہ تھی وہ محدود
ہوگئی۔ میں ایک مضبوط ارادے کا حامل تھا اور اپنے نفس کو اچھی طرح پہچانتا
تھا اور پھر کمزور ہوکر معرفتِ نفس کی آرزوئیں کرنے لگا۔ میں روح تھی
جو ہر سطح پر اڑتی اور ہر پردے کو پھاڑ کر اندر داخل ہوتی۔ پھر میں جسم کی حالت
میں بدل گیا جو بہت سستی سے اٹھتا اور اپنے اعضا کو بھاری زنجیروں کی
طرح کھینچنے کی کوشش کرتا ہے —— میں تھا اور میں ہوگیا —— میں تھا
اور میں ہوگیا —— میں یہی کلمات دہراتا رہا۔ یہاں تک کہ میں اپنے وجدان کے
دونوں سروں تک پہنچ گیا۔

بیس سال سے میں اپنی عقل سے یہی دریافت کررہا ہوں اور کوشش
کرتا ہوں کہ میں اس تبدیلی کی حقیقت اور اس انقلاب کی کیفیت کو پوری
طرح معلوم کرسکوں لیکن مجھے پوری کامیابی نہ ہوئی اور میرا خیال ہے کہ پوری

کامیابی کبھی حاصل نہ ہوگی —— ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں ایک ہی وقت میں صاف و صریح بات کو اور نہایت ہی باریک نکتے کو یاد رکھ سکتا ہوں —— مجھے یاد ہے کہ اس وقت جب میں ایتھر کی شکل میں تھا مجھے ایک ہولناک حادثہ پیش آیا۔ میرے داخلی محیط میں اس عالم میں جسے "میں، میں تو میں ہی ہوں" پکار رہا تھا یہ حادثہ رونما ہوا جسے میں دھماکا کہہ سکتا ہوں اور اور تمام عالم سارے کا سارا ہانڈی بن کر جوش مارنے لگا اور اس سے جھاگ نکلنی شروع ہوئی پھر ہنڈیا میں ہیجان آیا اور اس سے ایک زبردست آندھی پیدا ہوئی جس نے اپنے زور سے میرے عالم کے ہر ساکن ذرہ کو اڑایا۔ میرا مالک در میرا مملوک سکون یکایک ایک مہیب اور خطرناک گرج میں تبدیل ہو گیا جس سامتی کے ساتھ میرا معانقہ ہوا کرتا تھا ایک بجلی بن گئی اور وہ غیر محدود معرفت جو ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لے کر اس کے اسرار اور دقائق کو معلوم کیا کرتی تھی یکایک چند در چند تشویشوں میں بدل گئی اور وہ عالم بالا کی وہ خاموشی جو میری گہرائیوں میں ساکن تھی ان گنت درد کی ماری ہوئی عورتوں کی چیخیں، لاکھوں بھوکے شیروں کی دھاڑیں اور بے شمار جرسوں کی آوازیں نکالنے لگی۔ یہ شور و شر معلوم نہیں کتنی مدت جاری رہا۔ ایک منٹ

یا پورا زمانہ۔ پھر ہر حرکت ساکن ہوگئی۔ ہر آواز خاموش اور ہر تشنہ لیش ختم ہوگئی میں اب ساکن تھا۔ اس شخص کی طرح جسے ہر طرف سے دبایا گیا ہو تھوڑے ہی عرصہ میں دباؤ اور تنگی کے باوجود میں خاموشی سے تابع فرمان ہوگیا پھر میں نے ایک نہایت ہی بوجھل اور غالب نیند کا احساس کیا اور گہری تاریکیوں میں جاکر گہری نیند سو گیا۔"

سلیم باتوں سے رک گیا۔ اس کے چہرے سے تھکان کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔ وہ ایسے ہانپ رہا تھا جیسے گھوڑا گھوڑ دوڑ کے بعد سانس لیا کرتا ہے پھر اس نے مجھے ایسی آنکھوں سے دیکھا جن سے لطیف شعاعیں نکل رہی تھیں اور کہا۔" اس کے بعد۔ اس طوفان اور اس سکون کے بعد اس گراں خوابی اور گہری نیند کے بعد میں بیدار تو ہوا لیکن اس مدہوش کی طرح جس کے وجدان پر غفلت کے پردے پڑے ہوں میں نے اپنے آپ کو ایک عورت کے ہاتھوں میں ایک بے بس بچہ کی شکل میں پایا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، پیار اور محبت سے مسکرا رہی تھی۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کے آسمانی سفر نے اس کی روح اور اس کے جسم کو تھکا دیا ہے اس لئے میں نے کہا۔ "بھائی! بس اتنا کافی ہے۔ مجھے تم نے

ان اسرار سے آگاہ کیا جو تم سے پہلے کسی انسان نے مجھے نہیں بتلائے۔ اس وقت تمہیں مزید آرام اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس سے آگے اسوقت کچھ نہ کہو۔"

اس نے کہا "اس کے بعد میرے پاس کہنے کی کوئی بات ہے بھی نہیں میں نے تمام وُہ باتیں جو مجھے یاد تھیں اور جن کو میں حاصل کر سکا تھا۔ تم سے بیان کر دیں لیکن میں اب تک اپنی معلومات اور اپنی یاد کی ہوئی باتوں میں گم ہوں میں ہمیشہ ضائع ہوں ہمیشہ ضائع۔"

تھوڑی دیر اسی طرح بالکل خاموشی رہی۔ مجھے وُہ بھیڑا سا وقت اور اس کی تاثیر زندگی بھر یاد رہیں گے۔ میں نے اپنے نفس میں ایک بالکل نیا احساس پایا۔ میں نے اپنے دل پر شراب کے نشے کا اثر محسوس کیا اور تحیر تفکرات نے مجھے آ گھیرا۔

جب رات آدھی گذر گئی سلیم یہ کہتے ہوئے اُٹھا "ہم بہت دیر تک جاگتے رہے اب میں جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "بھائی۔ ابھی نہ جاؤ۔ آج کی رات میرے مہمان رہو۔"

اس نے جواب دیا "نہیں۔ میں ایسے مکان میں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا

جس کی فضا میں آوازیں مرتعش نظر آتی ہوں اور اس کے گوشوں میں جالے گھومتے ہوئے نظر آتے ہوں۔ میرے لئے ضروری ہے کہ کسی خالی اور پرسکون مقام کی تلاش کر دوں"۔

وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اور یوں بھاگتے ہوئے نکلا جس طرح جلتے ہوئے مکان سے کوئی جان بچانے کی خاطر بھاگتا ہے۔

اس وقت سے لے کر اب تک مجھے جب بھی سلیم یاد آتا ہے۔ میرا فکر زمانے کو دیں دنہار میں تقسیم کرنے والے ہر پیمانے سے پھر جاتا ہے اور جب کبھی اس کی بات یاد آتی ہے تو میں ان سارے امتیازات سے ہٹ جاتا ہوں جو زمانے کو دائیں بائیں میں تقسیم کر دیں۔ میں جب اس کا چہرہ، اور اس کی دا: کو یاد کرتا ہوں تو میری سمجھ وجود کے ظاہری اشکال اور باطنی آرا کا مقابلہ کرنے میں گم ہو جاتی ہے۔

ہاں میں نے سلیم کی طرح کا آدمی نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ کبھی ملیگا۔ وہ لوگوں میں رہتا ہے مگر ان میں شمار نہیں۔ وہ دنیا میں ہے مگر یہاں کا رہنے والا نہیں بسا اوقات میں دل میں یہ سوچتا ہوں کہ میں اس سے اس کمرے میں ایک گھنٹہ

ان اسرار سے آگاہ کیا جو تم سے پہلے کسی انسان نے مجھے نہیں بتلائے۔ اس وقت تمہیں مزید آرام اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس سے آگے اسوقت کچھ نہ کہو۔"

اس نے کہا۔ "اس کے بعد میرے پاس کہنے کی کوئی بات ہے بھی نہیں میں نے تمام وُہ باتیں جو مجھے یاد تھیں اور جن کو میں حاصل کر سکا تھا۔ تم سے بیان کر دیں لیکن میں اب تک اپنی معلومات اور اپنی یاد کی ہوئی باتوں میں گم ہوں میں ہمیشہ ضائع ہوں ہمیشہ ضائع۔"

تھوڑی دیر اسی طرح بالکل خاموشی رہی۔ مجھے وُہ تھوڑا سا وقفہ اور اس کی تاثیر زندگی بھر یاد رہیں گے۔ میں نے اپنے نفس میں ایک بالکل نیا احساس پایا۔ میں نے اپنے دل پر شراب کے نشے کا اثر محسوس کیا اور گہرے تفکرات [illegible]۔

جب رات آدھی گذر گئی سلیم یہ کہتے ہُوئے اُٹھا۔ "ہم بہت دیر تک جاگتے رہے اب میں جاتا ہوں۔"

مَیں نے کہا۔ "بھائی۔ ابھی نہ جاؤ۔ آج کی رات میرے مہمان رہو۔"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں! میں ایسے مکان میں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا

جس کی فضا میں آوازیں مرتعش نظر آتی ہوں اور اس کے گوشوں میں سائے گھومتے ہوئے نظر آتے ہوں۔ میرے لئے ضروری ہے کہ کسی خالی اور پرسکون مقام کی تلاش کر دوں"۔

وہ لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اور یوں بھاگتے ہوئے نکلا جس طرح جلتے ہوئے مکان سے کوئی جان بچانے کی خاطر بھاگتا ہے۔

اس وقت سے لے کر اب تک جب بھی سلیم یاد آتا ہے۔ میرا فکر زمانے کو لیل و نہار میں تقسیم کرنے والے ہر پیمانے سے پھر جاتا ہے اور جب کبھی اس کی بات یاد آتی ہے تو میں ان سارے امتیازات سے ہٹ جاتا ہوں جو زمانے کو دائیں بائیں میں تقسیم کر دیں۔ میں جب اُس کا چہرہ، اور اس کی آواز کو یاد کرتا ہوں تو میری سمجھ وجود کے ظاہری اشکال اور باطنی اسرار کا مقابلہ کرنے میں گم ہو جاتی ہے۔

ہاں میں نے سلیم کی طرح کا آدمی نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ کبھی ملیگا۔ وہ لوگوں میں رہتا ہے مگر ان میں شمار نہیں۔ وہ دنیا میں ہے مگر یہاں کا رہنے والا نہیں بسا اوقات میں دل میں یہ سوچتا ہوں کہ میں اُس سے اس کمرے میں ایک گھنٹہ

دو گھنٹے کے لئے ملا تھا یا میں نے اس کے ساتھ فضا میں ایک طویل زمانہ گذارا ہے۔ میں اپنے حافظہ پر زور دے کر یاد کرتا ہوں کہ میں نے اسے خواب میں دیکھا تھا یا بیداری میں۔ اس کا فیصلہ میں صرف اس ایک دلیل سے کر سکتا ہوں کہ نادر حقائق بیداری ہی میں ظاہر ہوتے ہیں اور تسلیم بھی ایک نادر حقیقت ہی ہے۔

Much fine, most excellent.
Long live to his principles.
His earthly body was
buried, not his thoughts
not his doctrines and he
is Khalil Gibran.

چند سوالات

(۱) عربی زبان کا مستقبل کیا ہے؟

ادب پوری قوم اور اس کی ہیئت کلی میں قوتِ تجدید کے آثار میں سے ایک نشانی ہے۔ جب تجدید کی قوت کمزور ہو جائیگی تو ادب بھی اس کے ساتھ ہی اپنے مقام پر ٹھہر جائیگا۔ ٹھہرنے کے ساتھ ہی اس میں رجعت پیدا ہوگی اور رجعت کے ساتھ اس کی موت اور اس کا مٹ جانا ضروری اور لازمی ہے۔

اس لئے عربی ادب کے مستقبل کا دار مدار عربی بولنے والی قوموں

کے اندر مجددانہ فکر کے وجود و عدم پر موقوف ہے اگر یہ فکر موجود ہے تو ادب
عربی کا مستقبل اپنے ماضی کی طرح شاندار رہے اور اگر یہ فکر موجود نہیں تو
اس کا مستقبل بھی سریانی اور عبرانی سے زیادہ شاندار نہیں رہیگا۔

اور یہ قوتِ تجدید کس چیز کا نام ہے؟

یہ قوم کے اندر ایسے جذبے کا نام ہے جو اسے آگے کی طرف دھکیلتا
ہو۔ وہ اس کے دل میں بھوک پیاس اور غیر معلوم چیز کو حاصل کرنے کے شوق
کا دوسرا نام ہے۔ یہ اس کی روح کو پیش آنے والی خوابوں کے ایک سلسلے کا
نام ہے جس کی جستجو میں وہ دن رات لگا ہوا ہو۔ لیکن وہ جب بھی اس مسلسل
زنجیر کی ایک کڑی کھولتا ہے۔ حیات زنجیر کی دوسری طرف ایک اور کڑی
لگا دیتی ہے۔ یہ افراد میں برتری اور قوم میں شجاعت کا نام ہے اور افراد
میں برتری کے معنی یہی ہیں کہ وہ جماعت کے مخفی احساسات کو ظاہری اور
محسوس شکل دینے کی قدرت رکھیں۔ اسی وجہ سے جاہلیتِ عرب کے ایام
میں عرب کا شاعر ابھی تیاری میں مشغول تھا۔ اس لئے کہ پوری قوم تیاری
میں مشغول تھی اور مخضرمین کے زمانہ میں شاعر بڑھ رہا تھا اور پھیل رہا تھا۔ اس
لئے کہ یہ زمانہ قوم کے بڑھنے اور پھیلنے کا تھا اور مولدین کے زمانے کا شاعر

فنونِ شعر کے شعبوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت اُمّتِ اسلامیہ فرقوں میں منقسم ہو رہی تھی۔ اس طرح شاعر ہمیشہ کبھی چپتا کبھی چڑھتا اور نئے نئے رنگ بدلتا رہا ہے کبھی وُہ فلسفی کے لباس میں ظاہر ہوتا کبھی وُہ طبیب بن جاتا ہے اور کسی وقت وُہ آسمانوں کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ جب قوم عرب کی بیداری پر نیند کا خمار چھانے لگا اور آخر وُہ سو ہی گئیں تو شاعری تُک بندی تک محدود ہوگئی۔ فلسفی علم کلام کے مباحث میں اُلجھ کر رہ گئے۔ طبیبوں نے حیلہ سازیاں اختیار کیں اور ہیئت دان نجومی بن کر رہ گئے۔

ان واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عربی ادب کا مستقبل ان قوموں کی قوّتِ بیداری کے ساتھ وابستہ ہے جو عربی بولتی ہیں۔ اگر یہ تمام اقوام ایک ہی وحدت کی قائل ہیں اور اس وحدتِ اجتماعی میں لمبی نیند کے بعد بیداری کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں تو سمجھ جاؤ کہ ادبِ عربی کا مستقبل شاندار ہے اور اگر ایسا نہیں تو عربی ادب کا مستقبل تاریک ہی رہیگا۔

(۲) سوال:- یورپی تمدّن اور مغربی روح کا اثر عربی ادب پر کیا ہوگا؟

ادب تو ایک قسم کی غذا ہے جس کو زبان باہر سے خوب چبا کر نگلتی ہے اور اس کے مفید حصّہ کو اپنی زندہ ہیئت کا جزو بناتی ہے۔ بعینہٖ وہی عمل جو درخت کو روشنی، ہوا اور مٹی کے ساتھ کرنا پڑتا ہے اور جس کے بعد یہ اجزا ٹہنیوں، پتّوں، کلیوں اور پھلوں میں تبدیل ہوتے ہیں۔ اگر ادب کے پاس چبانے کے لئے دانت اور ہضم کرنے کے لئے معدہ ہی نہ ہو تو غذا کی تاثیر نہ صرف بیکار بلکہ زہر سے بھی زیادہ مُضر ثابت ہو سکتی ہے۔ کیا آپ نے ایسے پودے نہیں دیکھے جو سایہ میں کچھ نہ کچھ سرسبزی و شادابی رکھتے ہیں لیکن سُورج کی روشنی میں آتے ہی مُرجھا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ مشہور ضرب المثل ہے کہ "سرمایہ دار کا سرمایہ بڑھتا رہتا ہے مگر مفلس آدمی اپنا بچا کھچا بھی کھو دیتا ہے"

مغربی رُوح تو انسان کے مختلف ادوار میں سے ایک دَور اور اس کی زندگی کا ایک حصّہ ہے۔ انسانی زندگی ایک تیز رو قافلے کی طرح ہمیشہ آگے کی طرف دوڑتی چلی جاتی ہے۔ اس کے اردگرد پیدا ہو کر اُڑنے والی سُنہری گرد سے مختلف حکومتیں، مختلف زبانیں اور مختلف مذاہب بنتے ہیں اس قافلہ کے آگے آگے جانے والی قوم ایک بیدار قوم ہوا کرتی ہے اور یہی قوم دائماً مؤثر ہوا کرتی ہے۔ ان کے پیچھے پیچھے جانے والی تمام قومیں مقلّد

ہوتی ہیں اور اس قوم کا اثر قبول کر لیا کرتی ہیں جس وقت تک مشرقی اقوام
آگے آگے تھیں اور مغرب کی قومیں ان کے نقشِ قدم پر چل رہی تھیں اُس
وقت ہمارا تمدن اور ہمارا ادب ان پر اثر انداز رہا۔ لیکن اب وُہ ہم سے آگے
بڑھ گئے ہیں اور ہمیں اُنہوں نے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے بالکل قدرتی
طور پر ان کے تمدن، ان کے ادب، ان کے اخلاق و افکار کا اثر ہماری زندگی
کے ہر شعبے پر پڑیگا۔

فرق یہ ہے کہ پہلے دَور میں مغرب کی قومیں ہماری تیار کی ہُوئی غذا
ہم سے لے کر باقاعدہ چبا چبا کر کھا لیا کرتی تھیں اور اس کے مفید اجزاء کو اپنے
مغربی رنگ میں رنگ لیتی تھیں لیکن ہم مشرقی اقوام اِس وقت مغرب
سے حاصل کی ہوئی غذا کی تاثیر نگل رہے ہیں اور اس کو ہضم نہیں کر
سکتے جس کا اثر یہ ہو رہا ہے کہ اس مفید چیز کو مشرقی رنگ میں رنگنے کی بجائے
ہم مغربی بننے لگے ہیں۔ ایسی نازک حالت سے مجھے خوف ہوتا ہے اور مَیں
اس سے بچنے کی فکر کر رہا ہُوں۔ مجھے مشرق کی یہ حالت دیکھ کر ایسا نظر آتا ہے
کہ مشرق یا تو ایک ضعیف العمر انسان ہے جس کے سارے دانت گر گئے
ہوں اور یا وُہ شیر خوار بچہ ہے جس کا کوئی دانت نکلا ہی نہیں۔

مغربی روح ہماری دوست ہے بشرطیکہ ہم اس پر قابو پالیں اور ہماری دشمن ہے اگر وہ ہم پر قابو پالے۔ دوست ہے اگر ہم اس کے لئے اپنے دل کھول دیں لیکن دشمن ہے اگر ہم اپنے قلوب بالکل اس کے حوالے کر دیں۔ دوست ہے اگر ہم صرف وہ چیزیں اس سے حاصل کریں جو ہمارے حالات کے موافق ہوں اور دشمن ہے اگر ہم اپنے آپ کو اس کے حالات میں ڈھال لیں۔

(۳) موجودہ سیاسی انقلاب کا اثر ممالک عربیہ پر کیا پڑیگا؟

مغرب اور مشرق کے تمام مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ ممالک عربیہ کی سیاسی، اجتماعی اور نفسیاتی حالت تشویش ناک ہے اور اکثر کا یہ خیال ہے کہ یہ تشویش بالآخر قوم کو تباہ اور نیست و نابود کر دیگی۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ تشویش ہے یا اکتاہٹ یا تھکان؟

اگر تھکان ہے تو تھکان پر امت کی انتہا اور ہر فرقے کا خاتمہ ہوتا ہے تھکان موت ہی کا دوسرا نام ہے جو نیند کی شکل میں ظاہر ہو۔

لیکن اگر یہ حقیقت میں صرف تشویش ہی ہے تو پھر میرے خیال میں تشویش کا انجام ہمیشہ اچھا ہی ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے قوم کی روح میں پوشیدہ ارادے ظاہر ہو جایا کرتے ہیں۔ اس کا نشہ اسی کے اٹھنے سے

زائل ہو جایا کرتا ہے اور وہ نیند سے بیدار ہو جایا کرتی ہے۔ تشویش تیز ہوا کی مانند ہے جو درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ کر نہیں پھینکتی بلکہ اس کی خشک شاخوں کو توڑ کر پھینک دیتی ہے اور خزاں زدہ زرد پتوں کو چھانٹ دیا کرتی ہے۔ تشویش جب ایسی قوم میں ظاہر ہو جائے جس کے فطری جذبات ابھی باقی ہوں تو یہ اس امر کی علامت ہوتی ہے کہ ان کے افراد میں بیداری اور ان کی اجتماعی روح میں استعداد موجود ہے۔ سدیم[1] زندگی کی کتاب کا پہلا لفظ ہے آخری نہیں۔

اس لئے میرا خیال ہے کہ موجودہ سیاسی انقلاب ممالک عربیہ کی تشویش کو ایک نظام میں بدل دیگا۔ اس کے اندرونی رموز و اشکال کو ترتیب دے کر باہم ملا دیگا۔ لیکن یہ انقلاب اس کی مایوسی کو وجد میں اور اس کی تھکان کو شجاعت میں نہیں بدل سکتا۔ کمہار مٹی سے شراب کیلئے برتن اور سرکے کیلئے لوٹا تو بنا سکتا ہے لیکن کنکروں سے یا ریت سے وہ کوئی برتن تیار نہیں کر سکتا۔

(۴) کیا عربی زبان مدارس عالیہ اور ابتدائی مدارس میں عام ہو جائیگی اور اسی میں تمام علوم پڑھائے جائینگے؟

[1] السدیم۔ نورانی لاوا۔ مادہ کی پگھلی ہوئی شکل جو جم کر منجمد ہو جائے۔

جب تک یہ تمام مدارس ایک ہی وطنی رنگ اختیار نہیں کرینگے اس وقت تک عربی زبان ان میں عام نہیں ہوسکتی۔ اور اس زبان میں تمام علوم اس وقت تک نہیں پڑھائے جائیں گے جب تک کہ تمام مدارس کا انتظام نیم ایرانی انجمنوں، فرقہ دار جماعتوں اور فریبی اداروں کے ہاتھوں سے چھین کر لوکل گورنمنٹوں کے ہاتھ میں نہ دیا جائے۔ مثال کے طور شام میں ہمارے پاس تعلیم ایک مدنیت کی شکل میں مغرب سے آئی تھی۔ ہم چونکہ بھوکے تھے اس لئے یہ مدنیت کی تعلیم جلدی سے نگل جایا کرتے تھے۔ اسی غذا نے ہمیں زندہ تو کر دیا لیکن زندہ کرنے کے ساتھ ہی بے جان بھی کر دیا۔ ہمیں زندہ کر دیا اس لئے کہ اس کی وجہ سے ہمارے بعض احساسات جاگ اُٹھے اور عقلیں تھوڑی سی بیدار ہوئیں اور ہمیں بے جان یوں کیا کہ ہماری آواز کو منتشر کر دیا۔ ہماری وحدت کو کمزور کر دیا۔ ہمارے تعلقات کو آپس میں منقطع کرا دیا اور ہمارے فرقوں کو ایک دوسرے سے بہت دُور پھینک دیا یہاں تک کہ ہمارا وطنِ عزیز چھوٹی چھوٹی نوآبادیوں میں بدل گیا جن کے ذوق اور جن کے مشرب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ہماری ہر نوآبادی جُدا جُدا مغربی طاقت سے وابستہ ہے اور اُسی کا جھنڈا سر بلند کئے ہوئے کھڑی ہے اور اُسی کے گُن گاتے ہیں

مصروف ہے۔ ہمارا جو نوجوان امریکہ کی کسی درسگاہ کا تعلیمیافتہ ہے وُہ
طبعی طور پر امریکن طرزِ معاشرت کا دلدادہ ہے۔ دُوسرا نوجوان جس نے عیسائی
درسگاہ کی گود میں کچھ حاصل کیا وُہ فرانس کا سفیر بنا بیٹھا ہے۔ وُہ نوجوان جس
نے رُوس کی کسی درسگاہ کا یونیفارم پہنا ہے وُہ رُوس کے رنگ میں رنگا ہوا
نظر آتا ہے۔ غرضیکہ جتنی درسگاہیں مغرب میں نظر آتی ہیں ان کے الگ الگ
رنگ ہمیں اپنے چھوٹے سے وطن میں نظر آرہے ہیں۔ میرے اِس
دعوی کی بڑی دلیل وُہ سیاسی نظریئے ہیں جو موجودہ دَور میں شام کے سیاسی
مستقبل کے متعلّق مختلف شکلوں میں ظاہر ہو رہے ہیں جن لوگوں نے انگریزی
زبان کے ذریعے کچھ حاصل کیا ہے وُہ چاہتے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ ہمارا
نگران ہو۔ جنہوں نے فرانسیسی زبان کے ذریعے کچھ حاصل کیا ہے وُہ فرانس
کی سیادت کو ترجیح دیتے ہیں اور جنہوں نے ان دونوں زبانوں میں سے
کسی زبان کے ذریعہ کچھ حاصل نہیں کیا وُہ اپنی عقل کی رسائی کے مطابق
اپنی ہی سیاست کو ترجیح دیتے ہیں اور ان دونوں طاقتوں میں سے کسی کی پناہ
میں آنا پسند نہیں کرتے۔

کبھی ہمارا سیاسی میلان اس قوم کی طرف ہوتا ہے جس کے خرچ سے

ہم تعلیم حاصل کرتے ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مشرق کے رہنے والے احسان کے قدر شناس ہیں۔ لیکن آخر یہ کونسی ممنونیت ہے جو ایک پتھر کو ایک طرف سے رکھتی ہے اور دوسری طرف سے پوری دیوار کو گراتی جاتی ہے۔ یہ کونسا جذبہ ہے جو ایک پودا اُگاتا ہے اور پورے گلشن کو دوسری طرف سے کاٹتا ہے۔ یہ کونسی نمک حلالی ہے جو ہمیں ایک دن کیلئے تو زندہ کرتی ہے لیکن دائمی موت کی نیند سُلا دیتی ہے؟

مغرب کے حقیقی محسنوں نے ہماری اس غذا میں جو انہوں نے ہم تک پہنچانے کی کوشش کی کانٹے نہیں ملائے۔ اُنہوں نے ہمیں نفع پہنچانے کا ارادہ کیا تھا ہمیں نقصان پہنچانے کا نہیں۔ لیکن پھر یہ کانٹے کہاں سے آ ملے اور یہ گھو کرو کہاں سے اس میں مل گئے۔ یہ ایک الگ سوال ہے جس کے متعلق میں یہاں کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔

ہاں عنقریب جب عربی زبان ابتدائی و انتہائی مدارس میں رائج ہوگی اور تمام علوم کے پڑھانے کا ذریعہ یہی زبان ہوگی تو اس وقت ہمارے سیاسی میلانات میں اتحاد پیدا ہوگا اور قومی تفرقات ختم ہو کر رہ جائیں گے اس لئے کہ مدرسہ ہی وہ مقام ہے جہاں مختلف میلانات یکجا ہو جاتے ہیں اور تفرقے

ختم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اُس وقت تک نہیں ہوگا جب تک قوم کے بچّے قوم ہی کے خرچ پر تعلیم حاصل نہ کریں۔ یہ اُس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کہ ہمارا ہر ایک فرد ایک ہی وطن کا فرزند نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ہی انسان اپنے ظاہری جسم کے اعتبار سے ایک وطن کا فرزند ہو اور اس کی رُوح کسی دُوسرے ایسے مُلک کے گُن گا رہی ہو جو پہلے وطن سے بالکل مختلف ہے یہ اُس وقت تک نہیں ہوگا جب تک ہم صدقہ سے حاصل کی ہُوئی غذا کو ایسی غذا میں تبدیل نہ کر دیں جو ہمارے ہی گھر کی تیار کردہ ہو۔ اس لئے کہ ایک محتاج فقیر کی طاقت سے یہ باہر ہے کہ وُہ صدقہ دینے والے کو کسی شرط کا پابند کر دے جو شخص صدقہ لے کر اپنا نفس ذلیل کر لیتا ہے وُہ صدقہ دینے والے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ محتاج ہمیشہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اور دینے والا ہمیشہ صاحبِ اختیار رہتا ہے۔

(۶) کیا فصیح عربی باقی تمام مختلف عام لہجوں پر غالب آ جائیگی اور عربی زبان بالکل ایک ہو جائیگی؟

عام لہجے بدلتے رہتے ہیں اور مہذّب ہوتے ہیں۔ کرخت لہجے استعمال میں آتے آتے نرم ہو جاتے ہیں لیکن وُہ مغلوب کبھی نہیں ہوتے اور جیسا ہے

بھی یہی کہ وُہ مغلوب نہ ہُوں۔ اس لئے کہ یہی عام لہجے ہی توفصیح زبان کا اصل منبع ہیں اور یہی تو ترقی یافتہ ادب کا سرچشمہ ہیں۔

دُنیا کی ہر چیز کی طرح زبانوں میں بھی بقائے انسب (Survival of the fittest) کا قانون جاری ہے اور عامیانہ لہجوں میں بھی انسب (FITTEST) کا کافی ذخیرہ موجود ہے جس کا باقی رہنا ضروری ہے کیونکہ وُہ قوم کے ذہن اور اس ہیئت وجدانی کے مقاصد میں زیادہ کارآمد ہیں۔ اس ذخیرہ کے باقی رہنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ یہ ادب کے جسم میں گھُل مل کر اس کے اجزا میں شمار ہو جائیگا۔

مغربی اقوام کی تمام زبانوں کے عامیانہ لہجے موجود ہیں۔ یہ عامیانہ لہجے ایسے ادب اور فن کے آئینہ دار ہیں جو پسندیدہ خصوصیات اور ترقی پسند جدّت کا مجموعہ ہیں۔ بلکہ یورپ اور امریکہ میں ایسے فطری شاعر بھی موجود ہیں جو عامیانہ لہجوں کو فصیح زبان کے ساتھ ملا کر قصائد اور مسدسات بناتے ہیں اور ان میں بڑی بلاغت اور تاثیر ہوتی ہے میرے خیال میں تو موال زجل۔ عتابا اور معنّی (عربی دیہاتی گانے) میں وُہ نئے نئے نفیس نکتے، لطیف استعارے اور قابلِ تعریف تعبیرات موجود ہیں۔ اگر ہم ان کا مقابلہ

ان معیاری قصائد سے کریں جو فصیح زبانوں میں کہے جاتے ہیں اور جرائد اور ماہناموں میں شائع ہوتے ہیں تو اس طرح خوبصورت معلوم ہوں جیسے بیجان کاگلدستہ لکڑیوں کے ڈھیر کے ساتھ یا جیسے ناچنے گانے والی لڑکیوں کا غول
جدید اطالوی زبان زمانۂ وسطیٰ میں ایک عامی زبان تھی۔ اس زمانے کے خواص کا طبقہ زبان کو "لہجہ" (گنواروں کی زبان) کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ لیکن جب ڈینٹے۔ تبراک۔ کاموانس اور فرانسیسی ورسینزی نے اسی زبان میں اپنا بہترین اور غیر فانی کلام دنیا کے سامنے پیش کیا تو یہی زبان اٹلی کی فصیح زبان سمجھی جانے لگی اور اس کے بعد لاطینی زبان لاش کی طرح صرف چند رجعت پسند جماعتوں کے کندھوں پر پڑی ہوئی ملک میں گشت لگاتی رہی۔ مصر، شام اور عراق کے عوام کی زبان اور موسیٰ اور متنبی کی زبان میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ اٹلی کے عوام اور لوقیدی اور فرجیل کی زبان میں تھا۔ بالکل اسی طرح اگر مشرق میں بھی کوئی مافوق الفطرت ہستی پیدا ہوئی تو اس عامی زبان کا شمار فصیح و بلیغ زبانوں میں سے ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے کوئی اُمید ہی نہیں کہ مشرق میں ایسا کوئی انسان پیدا ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مشرق کے

رہنے والے حال واستقبال کی نسبت اپنے ماضی کی جانب زیادہ مائل رہتے ہیں اور جانے بوجھے یا بے سمجھی سے اپنے ماضی کی حفاظت ہی میں لگے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ہم میں کوئی انسان پیدا بھی ہوا تو وہ اپنی فطری خوبیوں کو اسی قدیم طرز میں ظاہر کریگا۔ حالانکہ اسلاف کا طریقۂ فکر کی پیدائش اور موت کے درمیان مختصر ترین راستے کے سوا اور کچھ نہیں۔

(۷) عربی زبان کو زندہ کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

زبان کو زندہ کرنے کا بہترین ذریعہ نہیں بلکہ واحد ذریعہ شاعر کے دل میں ہے اس کی زبان پر ہے اور اس کے ہاتھ میں ہے۔ قوّتِ ایجاد کی درمیانی کڑی شاعری ہے۔ شاعری وہ کڑی ہے جو دل میں پیدا ہونے والے خیالات کو دنیا کی نظروں کے سامنے لاتا ہے اور ذہنی دنیا کے فیصلہ شدہ امور کو حفظ و تدوین کی دنیا میں لاڈالتا ہے۔

شاعری زبان کا باپ اور اس کی ماں ہے۔ جہاں شاعر جاتا ہے وہیں زبان جاتی ہے۔ جہاں شاعر ٹھیرتا ہے اسی جگہ زبان بھی ڈیرے ڈال دیتی ہے اور جب وہ شاعر دنیا کو چھوڑ جاتا ہے تو زبان اس کی قبر پہ بیٹھ کر روتی ہے اور اُس وقت تک آہ و بکا کرتی رہتی ہے جب تک کہ کوئی

اور شاعر اگر اس کا ہاتھ تھام نہ لے۔

جس طرح شاعر زبان کا ماں باپ ہے اسی طرح اندھی تقلید کرنے والا اُس کا کفن دوز اور گورکن ہے۔

شاعر سے میری مُراد ہر وُہ موجد ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اور وُہ شخص ہے جو اسرار کو کھول کر بیان کرے وُہ کمزور ہو یا طاقتور، ہرنئی بنیاد رکھنے والا ہے وُہ باعزت ہو یا حقیر، خالص زندگی کا ہر وُہ خبر خواہ جو قوم کا امام ہو یا بے بس فقیر، اور ہر وُہ شخص ہے جو گردشِ لیل و نہار کے سامنے کمربستہ کھڑا ہو چاہے وُہ فلسفی ہو یا باغ کا مالی۔

مقلّد سے میری مُراد ہر وُہ شخص ہے جو اپنی طبیعت سے کوئی چیز پیدا نہ کرے جو اپنے آپ کسی بھید کے رموز کھول نہ سکے بلکہ اُس کی نفسانی زندگی اپنے ہمعصروں کی امداد پر موقوف ہو اور وُہ اپنا معنوی لباس اُن لوگوں کے پھٹے پُرانے کپڑوں سے بنائے جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں

شاعر سے میری مُراد وُہ کسان ہے جو اپنی کھیتی میں ایسا ہل چلاتا ہے جو اس کے باپ کے ہل سے مختلف ہو خواہ وُہ فرق کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو تاکہ بعد میں آنے والے لوگ اس نئے ہل کو کسی نئے نام سے پکاریں۔

میری مُراد وُہ باغبان ہے جو زرد اور سُرخ پھُول کے درمیان ایک نئے رنگ کا پھُول پیدا کرتا ہے اور بعد میں آنے والی نسل اس نئے پھُول کو نئے نام سے پکارے، میری مُراد وُہ جلاہا ہے جو اپنی کھادی پر ایسے ایسے نقش و نگار کا کپڑا تیار کرتا ہے جو اُس کے پڑوسی جلاہوں کے نقش و نگار سے مختلف ہو اور بعد میں آنے والے انسان اس کپڑے کو نئے نام سے پکارتے ہیں۔ شاعر سے میری مُراد وُہ ملّاح ہے جو اپنی کشتی کے دو بادبانوں کے ساتھ ایک اور بادبان کی زیادتی کرتا ہے۔ اور وُہ معمار ہے جو ایک دروازہ اور ایک کھڑکی رکھنے والے گھروں میں ایک ایسا مکان بناتا ہے جس کے کمروں میں دو دروازے اور دو کھڑکیاں ہوں۔ شاعر سے میری مُراد وُہ رنگساز ہے جو ایسے رنگوں کو آپس میں ملاتا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہیں ملائے اور اس طرح ایک نیا رنگ دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایسے ملّاحوں، معماروں اور رنگسازوں کے بعد آنے والی قوم ان کی کاریگری کو ایک نئے نام سے پکاریگی۔ اور اس طرح لغت کی کشتی میں ایک بادبان، لغت کے کمرے میں ایک کھڑکی اور لغت کے لباس میں ایک رنگ کا اضافہ ہوگا۔

مقلد وُہ انسان ہے جو ایک جگہ سے دُوسری جگہ کو اسی راستے سے

جاتا ہے جس پر ہزاروں قافلے اس سے پہلے گذرے ہونگے صرف اس خوف سے کہ کہیں وہ راستہ بھول کر گم نہ ہو جائے ——— وہی انسان جو اپنی معیشت، اپنی کمائی اور اپنے لباس میں وہی راہیں اختیار کرتا ہے جن پر اس سے پہلے ہزاروں قومیں گذری ہیں۔ اس طرح تو اس کی زندگی صرف ایک صدائے بازگشت ہے اور اس کا وجود ایک دور کی حقیقت کا گمنام سایہ ہے جس سے نہ وہ کچھ پہچان سکتا ہے اور نہ ہی وہ پہچاننے کا ارادہ رکھتا ہے۔

شاعر سے میری مراد وہ عبادت گذار ہے کہ جب وہ اپنے نفس کے مندر میں داخل ہوتا ہے تو بیک وقت روتا اور خوش بھی ہوتا ہے۔ سوگ کرتا اور خوشی کے گن بھی گاتا ہے۔ سنتا اور سناتا ہے پھر جب وہ باہر نکلتا ہے تو اس کے ہونٹوں اور اسکی زبان پر ان ایام کی عبادت کی مختلف اشکال اور راتوں کے مراقبوں کے مختلف اقسام کے لئے مختلف اسماء، افعال اور حروف ہوتے ہیں اور اس طرح اس کے اس عمل سے لغت کی سارنگی میں چاندی کے ایک تار اور لغت کی آگ میں جلنے کیلئے ایک اچھی دھونی کا اضافہ ہو جاتا ہے

اور مقلّد وہ عبادت گذار ہے جو نمازیوں کی نماز اور کلمہ خوانوں کے کلمات کو بلا ارادہ اور بے سوچے سمجھے دہراتا ہے اور اس طرح لُغت کو اُسی مقام پر چھوڑ دیتا ہے جیسے اسے ملا تھا۔

شاعر سے میری مُراد وہ عاشق ہے کہ اگر اسے کسی عورت سے عشق ہو جائے تو اس کی رُوح انسانوں کی راہ چھوڑ کر تنہائی اختیار کر لیتی ہے تاکہ وہ محبّت کے شیریں خوابوں، آگ کے شعلوں، رات کی ہولناکیوں، آندھیوں کی دہشت اور وادیوں کے سکون کا لباس پہن لے۔ پھر وہ واپس انسانوں کی طرف اس لئے لوٹتا ہے کہ اپنے تجربات کا تاج لغت کے سر پر رکھّے اور اپنے صبر و سکون کا ہار ادب کے گلے میں پہنا دے۔

لیکن مقلّد اپنی محبّت میں بھی مقلّد ہی رہتا ہے وہ غزل و تشبیہ میں بھی دوسروں کی پیروی کیا کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اگر وہ اپنی محبوبہ کے حسین چہرے اور اُونچی گردن کا ذکر کرتا ہے تو اسے چودھویں کا چاند اور ہرنی سے تشبیہ دیتا ہے اگر اسے اپنی محبوبہ کی سیاہ زلفوں، سیدھے قد اور سُرمگیں آنکھوں کی یاد آتی ہے تو وہ اُنہیں رات، نرم و نازک شاخ اور تیر سے تشبیہ دیتا ہے۔ اگر کبھی وہ شکوے شکایت پر اُتر آتا ہے۔ تو

"بیدار پلکوں" اور "جُدائی کے قُرب" ہی کا نام لیتا ہے۔ اگر وُہ اپنے بیان کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنا چاہے تو کہتا ہے "میری محبوبہ کے رُخسار گلاب کے پھُول کو سیراب کرنے کے لئے نرگسی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی بہلتے ہیں اور وُہ اپنی عناب جیسی انگلیوں کو برف جیسے دانتوں سے کاٹتی ہے"۔ غرضکہ ہمارا اندھا مقلّد اسی طرح کی باتیں کرتا رہتا ہے اور اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وُہ اپنی کُند ذہنی کی وجہ سے ادب کو زہر آلود کر رہا ہے اور اپنے شوقیانہ انداز سے ادب کی شرافت کو ختم کرنے کے درپے ہے۔

میں جدّت پسند طبائع کے فائدوں اور جامد طبیعتوں اور اُن کے نقصانات کا تو ذکر کر چکا۔ لیکن اُن لوگوں کے متعلّق کچھ بھی نہیں کہا جو اپنی ساری زندگی ڈکشنریاں بنانے، انسائیکلوپیڈیا مرتّب کرنے اور ادبی ادارے قائم کرنے میں گذار دیتے ہیں میں نے ان کے متعلّق اس لئے کچھ نہیں کہا کہ میرا خیال ہے یہ لوگ زبان کے مدوجزر میں کنارے کی مثال رکھتے ہیں۔ ان کا کام چھلنی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ یہ کام کچھ بُرا نہیں لیکن جب قوم کی قوتِ تخلیق کا ریزہ کاشت کرلے۔ سوکھے تنکوں کی فصل

کاٹنے اور اپنے کھلیانوں میں کانٹے جمع کرنے کے سوا اور کسی قابل نہ رہی ہو
تو چھاننے والا کیا چھانے گا۔ خاک چھانے گا!

مَیں پھر کہتا ہُوں کہ زبان کی احیاء، اس کی وحدت، اس کی عمومیت اور اس کے تمام متعلقات شاعری کے خیالات کے مرہونِ منّت تھے، ہیں اور رہیں گے۔ لیکن کیا ہم میں شاعروں کی جماعت موجود ہے؟

ہاں! ہم میں شاعر موجود ہیں۔ بلکہ مشرق کا ہر باشندہ شاعر بن سکتا ہے۔ چاہے وہ کھیت میں کام کر رہا ہو یا باغ میں مصروف ہو۔ چاہے وہ کھادی پر بیٹھا ہو یا عبادت خانے میں ہو۔ چاہے وہ منبر پر کھڑا خطبہ دینے میں مشغول ہو یا اپنی لائبریری میں مطالعہ کر رہا ہو۔ اسی طرح مشرق کا ہر باشندہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ تقلید کے قیدخانے سے باہر نکل کر سُورج کی روشنی میں آئے اور زندگی کے قافلے کے ساتھ گامزن ہو۔ مشرق کا رہنے والا یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ اپنی رُوح میں چھپی ہوئی قوت کو بیدار کر دے۔ وہی قوت جو ہمیشہ ہمیشہ سے موجود ہے تا ابد باقی رہے گی وہی قوت جو پتھروں سے خدا کے بیٹے بنانے کی طاقت رکھتی ہے لیکن وہ لوگ جو اپنے فطری جذبات کو نظم و نثر کا رنگ دے کر بیٹھیں

کیا کرتے ہیں ان سے میں مُستدعی ہُوں کہ تمہارے خصوصی مقاصد میں سے
ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہیئے کہ تم متقدّمین کی تقلید نہیں کرو گے۔ اس میں
تمہاری بھی بھلائی ہے اور عربی زبان کی بھی۔ تمہاری وہ چھوٹی سی جھونپڑی
جو تم اپنی طرف سے تیّار کر لو اُس عالیشان محل سے زیادہ بہتر ہے جو دوسروں
کے رحم و کرم پر ہو۔ تمہارے نفوس میں ایسا جذبہ ہونا چاہیئے جو تمہیں مدحیہ
قصائد۔ مراثی اور تہنیت ناموں کے لکھنے سے روکے۔ تمہارے لئے اور
عربی زبان کیلئے یہ زیادہ بہتر ہے کہ تم حقیر اور بیکار موت مرو بجائے اس کے
کہ تم اپنے دل کا خون انسانی بُتوں کے سامنے بہاؤ۔ تم میں ایسی قومی غیرت
ہونی چاہیئے جو تمہیں اپنے مشرقی تمدّن اور اس کے مسرّت و الم کی طرف
دھکیلے یہی تمہارے لئے اور عربی زبان کیلئے بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تم
اپنے ماحول کے حوادث سے متاثر ہو کر اپنے خیالات کو مغربی شاعروں کے
رنگ میں رنگ دو۔

اے زمین!

زمین! تُو کتنی حسین اور کتنی خوبصورت ہے!

تُو روشنی کا حکم ماننے کیلئے کتنی تیار رہتی ہے اور سُورج کے سامنے سر جھکانے کو فخر سمجھتی ہے۔

سائے کا لباس پہن کر تُو کتنی عجیب نظر آتی ہے اور رات کی تاریکی کی چادر اوڑھ کر تُو کتنی پیاری لگتی ہے۔

تیرے صبح کے گیت کتنے میٹھے ہیں اور تیری شام کی صدائیں کتنی ہولناک ہیں۔

زمین! تُو کتنی مکمل اور کتنی روشن ہے۔

مَیں تیرے میدانوں میں پھرا، تیرے پہاڑوں پر چڑھا، تیری وادیوں میں اُترا، تیری چٹانوں پر سے کُودا، تیری غاروں میں گھُسا۔ میدانوں میں تیرے تحمل کو پہچانا، پہاڑوں پر تیری عظمت کا اندازہ لگایا، وادیوں میں تیرے سکون کا نظارہ دیکھا، چٹانوں پر تیرے عزم کا تماشہ دیکھا اور غاروں میں تیری رازداری کا پتہ لگایا۔ تُو ہی ہے جو اپنی قوّت کے باوجود دھیلی ہُوئی ہے، اپنی تواضع کے باوجود سربلند اور بلندی کے باوجود پست ہے، اپنی سختی کے باوجود نرم ہے اور اپنے بے شمار بھیدوں کے باوجود ہر ایک کے سامنے کھُلی ہوئی ہے۔

مَیں نے تیرے سمندروں میں سفر کئے، تیرے دریاؤں میں اُترا اور تیری ندیوں کے کنارے کنارے چلا، ہر جگہ مَیں نے تیرے مد و جزر میں بقا کی آواز سُنی، زمانہ کو تیرے ٹیلوں اور صحراؤں میں گنگناتے ہوئے پایا۔ گھاٹیوں میں اور راستوں کے موڑ پر زندگی کو زندگی سے سرگوشی کرتے ہوئے دیکھا۔ تُو ہی بقا کی زبان اور اس کے ہونٹ ہے تُو ہی زمانہ کے تار اور اس کی انگلیاں ہے اور تُو ہی زندگی کا فکر اور اس کا بیان۔

تیری بادِ بہاری نے مجھے جگایا اور تیرے جنگلوں کی جانب لے گئی
جہاں تیری آہیں دھواں بن کر اُڑتی ہیں۔ تیری گرمی مجھے تیرے ہی
باغوں میں لے گئی۔ جہاں تیری کوششیں پھلوں کی صورت میں ظاہر
ہوتی ہیں۔ تیری خزاں مجھے تیری ہی انگور کی بیلوں کے پاس لے جا کر کھڑا کر
گئی جہاں تیرا خون شراب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور تیری سردی مجھے
تیری ہی آرامگاہ کی طرف لے گئی۔ جہاں تیرا شفاف پانی برف بکھیرتا ہے
غرض تو ہی موسمِ بہار میں مہکتی ہے۔ گرمی میں بارانِ کرم برساتی ہے۔ خزاں
میں فیاضی کرتی اور سردی میں صاف ہو کر سامنے آتی ہے۔

ایک خوشگوار رات کو میں اپنے نفس کے دروازے اور کھڑکیاں کھول
کر تیری جانب نکلا میری طبیعت حرص و طمع کی وجہ سے بوجھل تھی اور میں
غرور و تکبر کی بھاری زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ میں تیرے ستاروں کی طرف
ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور وہ تیری جانب دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ میں نے
اپنی بیڑیاں اور بوجھل زنجیریں دور پھینک دیں اور میں اچھی طرح جان گیا
کہ نفس کا حقیقی مقام تیری فضا ہے۔ اس کی اصلی خواہشات تیری خواہشات
سے وابستہ ہیں۔ اس کی سلامتی تیری سلامتی ہے اور اس کی سعادت سنہرے

غُبار ہیں ہے جو ستاروں کی جانب سے تُجھ پر پھینکا جاتا ہے۔

مَیں بادلوں میں گھری ہوئی رات میں تیری طرف نکلا۔ مَیں اپنی غفلت و جمود سے اُکتا گیا تھا۔ مَیں نے تجھے ڈراؤنا اور آندھیوں سے مسلّح پایا۔ تُو اپنے حال کے ذریعے اپنے ماضی سے لڑ رہی تھی، اپنی جدّت کی طاقت سے اپنی قدامت کو پچھاڑ رہی تھی اور کمزور کو قوی کا سہارا دے کر اُٹھا رہی تھی

مَیں سمجھ گیا کہ انسان کا نظام تیرا ہی نظام ہے۔ اُس کا قانون تیرا ہی قانون ہے اور ان کا راستہ تیرا ہی راستہ ہے اور مَیں نے معلوم کر لیا کہ جو کوئی اپنی خشک شاخوں کو اپنی ہی ہواؤں سے نہیں جھاڑ دے گا وُہ مایوسی و نامُرادی کی موت مر جائیگا۔ اور جو کوئی اپنے ہی حملوں سے اپنے بوسیدہ ورقوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں پھینکے گا وُہ نامُراد ہو کر فنا ہو جائیگا اور کوئی اپنے ماضی کے مُردہ واقعات کو نسیان کے کفن میں دفنائیگا نہیں، تو وُہ اپنے استقبال کے لئے کفن بن کر رہیگا۔

زمین! تُو کتنی معصوم ہے اور تیرا علم کتنا زیادہ ہے؟
تُو اپنے اُن فرزندوں کے لئے کتنی شفیق ہے جو حقیقت کو چھوڑ کر

اوہام میں پھنسے ہوئے ہیں اور جو حاصل کردہ اور ناحاصل شدہ مقاصد کے درمیان راہ گم کئے ہوئے ہیں۔

ہم روتے چیختے ہیں اور تو ہنستی ہے۔

ہم گناہ کرتے ہیں اور تو اُس کا کفّارہ دیتی ہے۔

ہم تجھے روندتے ہیں اور تو ہمارے پاؤں میں بچھی جاتی ہے۔

ہم ناپاک ہوتے ہیں اور تو ہمیں پاک کیا کرتی ہے۔

ہم سوتے ہیں اور خواب دیکھنے سے محروم ہیں اور تو ہمیشہ بیدار رہ کر بھی خواب کی دُنیا کی سیر کرتی ہے۔

ہم تیرے سینے میں تلواروں اور نیزوں سے زخم لگاتے ہیں اور تو زیتون اور بلسم سے ہمارے زخموں کو مندمل کرتی ہے۔

ہم تیرے وسیع میدانوں میں ہڈیاں اور کھوپڑیاں کاشت کرتے ہیں۔

ہم مُردار لاشیں تیرے سُپرد کرتے ہیں اور تو ہمارے خوشوں کو دانوں اور انگور کی بیلوں کو خوشوں سے پُر کرتی ہے۔

ہم تیری سطح کو خون سے داغدار کر دیتے ہیں اور تو ہمارے چہروں کو کوثر کے پانی سے دھوتی ہے۔

ہم تیرے چاروں عناصر حاصل کرکے ان سے توپ اور بندوق تیار کرتے ہیں لیکن تو ہمارے عناصر کو یکجا کرکے ان سے گلاب اور چنبیلی کے پھول اگاتی ہے۔

زمین! تیرا صبر کتنا بڑا اور تیری رحمدلی کتنی زیادہ ہے۔

زمین! تو کیا ہے اور کون ہے؟

کیا تو گرد و غبار کا ایک ذرہ ہے جو اللہ کے قدموں میں اس وقت اٹھا جبکہ وہ کائنات کے اس سرے سے اس سرے کی طرف چلا۔ یا تو لا انتہا کی ایک چنگاری ہے جو دنیا میں پھینکی گئی ہے۔

کیا تو کھجور کی وہ گٹھلی ہے جو اس لیے پھینکی گئی کہ اپنے جوش نمو سے چھلکے کو پھاڑ دے اور خدائی طاقت کے اتھر سے بھی بلند ہو۔

کیا تو سب سے بڑے جبار کی رگوں میں خون کا ایک قطرہ ہے یا اس کی پیشانی پر بہنے والے پسینہ کی ایک بوند؟

کیا تو وہ پھل ہے جسے سورج کافی دیر کے بعد ظاہر کرتا ہے؟ کیا تو اس ابدی درخت کا پھل ہے جس کی جڑیں ازل کی گہرائی تک پھیلتی اور جس کی شاخیں ابد کی بلندی تک چڑھتی ہیں؟ کیا تو کوئی ایسا جوہر ہے جسے زمانہ

کے معبود نے مسافت کے معبود کی ہتھیلی پر رکھ دیا ہے۔

کیا تُو فضا کی گود میں کھیلتا ہوا کمسن بچّہ ہے؟ یا وُہ بوڑھا ہے جو زمانے کے لیل و نہار کے تجربات سے نفع اندوز ہو کر ان کی نگرانی کرتا رہتا ہے؟

زمین! تُو کیا ہے اور تُو کون ہے؟

زمین! سچ تو یہ ہے کہ تُو میری ذات ہے تُو ہی آنکھیں اور آنکھوں کی بصیرت ہے۔ تُو ہی میری عقل، میری سمجھ اور میری نیند ہے۔ تُو ہی میری بھوک اور پیاس ہے۔ تُو ہی میری مسرت اور میرا غم ہے۔ تُو ہی میری غفلت اور بیداری ہے۔

تُو ہی میری آنکھوں کا نُور، میرے دل کا شوق اور میری روح کا دوام ہے۔

زمین! تُو میری ہی فراست ہے اگر میں نہ ہوتا تو تیرا وجود بھی نہ ہوتا۔

میں

"وہ اپنے انتہا پسندانہ خیالات میں جنون کی حد تک پہنچ چکا ہے۔
میرا خیال ہے وہ اس لیے لکھتا رہتا ہے کہ لوگوں کے اخلاق خراب
ہوں۔"

اگر شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مرد اور عورتیں شادی کے معاملے
میں جبران کے افکار کی پیروی کرنے لگیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خانہ داری کے
ستون گر جائیں گے۔ انسانی جماعت کی بنیادیں ہل جائیں گی اور یہ دنیا ایسے
جہنم کی شکل اختیار کرے گی جس میں شیطان بستے ہوں۔

اُس کے اسلوبِ صحافت کی آرائش و زینت خاک میں مل جائے وُہ تو انسانیت کا دشمن ہے"۔

"وُہ اشتراکی ملحد اور کافر ہے۔ہم اس پاک سرزمین کے باشندوں کو نصیحت کے طور پر کہتے ہیں کہ اس کی تعلیمات سے دُور رہیں اور اس کی کتابوں کو جلا ڈالیں تاکہ ان کا کوئی اثر اُن کے نفوس پر باقی نہ رہے"۔

"ہم نے اس کی کتابیں پڑھ ڈالیں اور دیکھا کہ وُہ میٹھے زہر کی مثال رکھتا ہے"۔

یہ میرے متعلق بعض لوگوں کی رائے ہے اور ٹھیک ہے اس لئے کہ میری انتہا پسندی جنون کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ مَیں تعمیر کی نسبت تخریب کے زیادہ درپے ہُوں۔میرا دل ان چیزوں سے متنفر ہے جن کی لوگ تعظیم کرتے ہیں اور میرے دل میں اُن چیزوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوُئی ہے جن سے تمام لوگ متنفر ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں انسانی جماعت کے خیالات معتقدات اور تقلیدی ارادوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھتا۔

بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ میری کتابیں میٹھے زہر کی مانند ہیں۔ ایک حقیقت جو مضبوط پردے کی آڑ سے ان کو نظر آتی ہے۔ صاف حقیقت تو یہ ہے کہ میں زہر کو کسی اور چیز میں ملا کر نہیں دیتا۔ بلکہ خالص زہر ملایا ہو ——— فرق اتنا ہے کہ زہر کے پیالے صاف و شفاف ہوا کرتے ہیں۔

وُہ لوگ جو اپنے دلوں کو میری طرف سے یہ عذر پیش کر کے اطمینان دلاتے ہیں کہ "وُہ ایک خیالی آدمی ہے جو بادلوں کی دُنیا میں اُڑنا چاہتا ہے"۔ وُہ وہی لوگ ہیں جن کی نظر صرف اُن شفّاف پیالوں پر پڑتی ہے اور ان کے اندر بھری ہُوئی شراب یا زہر تک ان کی نگاہ رسائی نہیں کرتی۔ اس لئے کہ ان کے کمزور معدے اس کو ہضم کرنے کے قابل نہیں۔

یہ تمہید ایک کرخت بے حیائی ظاہر تو کرتی ہے لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ دل کو چھیدنے والی بے حیائی شیریں الفاظ سے ادا ہونے والی خباثت سے بہتر ہے۔ بے حیائی اپنے اصلی رنگ میں اپنے آپ کو پیش کرتی ہے لیکن خباثت اور بے ایمانی ایسے لباس میں ظاہر ہونے کی کوشش کرتی ہیں جو اس کے لئے سلایا نہیں گیا۔

مشرق کے باشندے ہر مضمون ایسا چاہتے ہیں کہ وُہ شہد کی مکھی

کی طرح باغات میں پھر پھر کر کلیوں کا رس چوسے، اسے جمع کرے اور اس سے شہد کے چھتے تیار کرے۔

مشرق کے باشندے شہد ہی کو پسند کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی طعام ان کو اچھا نہیں لگتا۔ وہ شہد کھانے میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ ان کے نفوس سراسر ایسا شہد بن گئے ہیں جو آگ کی گرمی سے بہہ جاتا ہے اور برف کے تودوں پر رکھے بغیر منجمد نہیں ہو سکتا۔

مشرق کے باشندے ہر شاعر سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو ان کے بادشاہوں، افسروں اور پادریوں کے سامنے دھونی کی طرح جلائے مشرق کی فضا اس دھوئیں سے جو شاہی محلوں، قربانگاہوں اور مقبروں سے اٹھتا ہے مکدر ہو چکی ہے۔ لیکن ابھی وہ اس کو اور مکدر کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہی زمانے میں ایسے مدح گو شاعر موجود ہیں جو متنبی سے کم نہیں، ایسے مرثیہ خوان پائے جاتے ہیں جو خنساء سے بڑھے ہوتے ہیں اور ایسے تہنیت خواں بھی کم نہیں جو صفی الدین حلی کو مات کرتے ہوں۔

مشرق کے باشندے ہر مفکر سے یہ امید رکھتے کہ وہ ان کے آباؤ اجداد

کی تاریخ کی چھان بین کرے۔ وہ انہیں کے آثار و معتقدات کی تعلیم دیتا ہے
وہ اپنے قیمتی اوقات کی ہر گھڑی صرف انہیں کی طول طویل لغات، الفاظ
کے ہیر پھیر اور اس کے معانی و بیان میں صرف کر دے۔

مشرق کے رہنے والے، ہر مفکر سے یہی سننے کے خواہشمند ہیں کہ
بیدما، ابن رشد، اقرام سربانی اور یہ حماد دمشقی نے کیا کہا تھا۔ وہ چاہتے
ہیں کہ وہ اپنے مضامین میں بے کار نصیحتوں اور ارشادات اور ان میں استعمال
ہونے والے ان مواعظ و نصائح کے سوا اور کچھ نہ لکھے جن پر عمل پیرا ہونے
والے انسان کی زندگی گھاس کے اس کمزور تنکے کی طرح ہو جاتی ہے جو
سائے میں اُگا ہوا ہو اور اس کا نفس اس پانی کی طرح ہو جاتا ہے جس
میں تھوڑی سی افیون گھول دی گئی ہو۔

مختصر یہ کہ مشرق کے باشندے گذرے ہوئے زمانہ کے خیالات
میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دل کو لبھانے والی اور ہر قسم کے فکر و
غم سے آزاد کر دینے والی لا یعنی باتوں کو پسند کرتے ہیں۔ اگر ان کو پسند نہیں
آتے تو وہ افکار پسند نہیں آتے جو تعمیری ہوں جو ان کو جھنجھوڑ کر اس
گہری نیند کے خمار سے بیدار کر دیں جن میں غافل پڑے ہوئے میٹھے اور

پُرسکون خواب دیکھنے میں وُہ مست ہیں۔

مشرق وُہ مردِ بیمار ہے جس پہ باری باری ہر مرض حملہ آور ہوُا اور
وبائی امراض اس سے چمٹے رہے۔ یہاں تک کہ وُہ اس بیماری کا عادی
بن گیا مصیبتوں سے محبّت ہوگئی۔ وُہ اپنے مصائب و تکالیف کو نہ صرف
یہ کہ اپنی طبعی کیفیات سمجھنے لگا بلکہ ان کو ایسے اچھے اخلاق کا رُتبہ دیدیا جو
اچھّی رُوحوں اور صحیح جسموں میں پائے جاتے ہیں اور اسی لئے جب وُہ
دیکھتا کہ کوئی فردِ ان امراض کا مریض نہیں تو اسے خُدا کے عطا کردہ
کمالات و احسانات سے محروم سمجھنے لگتا۔

مشرق کے بے شمار ڈاکٹر اس مریض نے بستر کے گرد پھرتے ہیں
اس کے علاج کے لئے آپس میں مشورے کرتے ہیں لیکن افسوس ان میں
سے کوئی بھی اس کا صحیح علاج نہیں کرتا۔ بغیر اس کے کہ وقتی طور پر سکون
پیدا کرنے والی دوائیں پلا کر مرض کو دُور کرنے کی بجائے اسے طول دینے
کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ مدہوش کرنے والی دوائیں مختلف طرح کی مختلف شکل کی ادا

مختلف رنگ کی ہیں۔ یہ ایک دُوسری کی ملاوٹ ہی سے بنتی ہیں۔ جس طرح کہ ایک مرض سے دُوسرا مرض پیدا ہوا کرتا ہے۔ جب بھی مشرق میں کوئی جدید مرض نمودار ہوتا ہے۔ مشرق کا طبیب اس کے لئے بیہوشی کی ایک نئی دوا تجویز کر دیتا ہے۔

اسی طرح وُہ اسباب بھی بیشمار ہیں جن کی وجہ سے مرض اس قسم کی دواؤں کی آڑ لیتا ہے۔ ان میں سب سے اہم دو سبب ہیں ایک تو یہ کہ مریض اپنے آپ کو قضا و قدر کے مشہور نظریئے کے حوالے کر دیتا ہے اور دوسرا یہ کہ طبیب بُزدل ہیں وُہ ڈرتے ہیں کہ تکلیف دہ دوا دینے سے مریض کا مرض بھڑک نہ اُٹھے۔

مشرق کے یہ رُوحانی طبیب ہمارے اس مردِ بیمار کی خانگی، وطنی اور مذہبی بیماریوں کے لئے جس قسم کی مدہوش کُن دوائیں پلاتے ہیں ان کی چند مثالیں سُن لیجئے :۔

شوہر اپنی بیوی سے اور بیوی اپنے شوہر سے بعض فطری اسباب کی بنا پر تنگ آ کر ایک دُوسرے سے لڑتے ہیں۔ مار پیٹائی ہوتی ہے ایک دُوسرے کو چھوڑ جاتے ہیں لیکن ابھی پُورا ایک دن رات گذرنے نہ

پاتا۔ کہ شوہر کے خاندان والے بیوی کے خاندان کے افراد سے ملتے ہیں
ملمع سازی سے چمکتے ہوئے خیالات ایک دُوسرے کے سامنے رکھتے ہیں
اور وہ متفق ہو جاتے ہیں کہ میاں بیوی میں صلح کرائی جائے عورت کو بُلایا
جاتا ہے اُسے میٹھی میٹھی باتوں اور دل کو نرم کرنے والے نصائح سے رام
کیا جاتا ہے اور اس طرح وُہ مطمئن نہ ہونے کے باوجود شرم کے مارے
سرِتسلیم خم کر دیتی ہے۔ پھر شوہر کو بلایا جاتا ہے اور اس کے دماغ کو زرنگار
امثال و اقوال کے ذریعے ماؤف کر دیا جاتا ہے جن کی وجہ سے اس کے
خیالات نرم تو ہو جاتے ہیں لیکن بدلتے نہیں۔ اور یوں وقتی طور پر پھر
دونوں کے درمیان صلح ہو جاتی ہے۔ ان کی رُوحیں ایک دُوسرے سے
متنفر ہونے کے باوجود ایک ہی گھر میں ایک ہی چھت کے نیچے اپنے ارادے
کے بالکل خلاف زندگی گذارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ جب خویش و اقارب
کی پلائی ہوئی نشہ آور دوا کی مدہوشی اور اس کا اثر زائل ہوتا ہے ــــ
جو ضرور ہی زائل ہوتا ہے ــــ اُس وقت مرد پھر عورت سے نفرت
کا اظہار کرنے لگ جاتا ہے اور اسی طرح بیوی اپنی ناراضگی کو بے نقاب
کرنے لگ جاتی ہے لیکن وہی لوگ جنہوں نے پہلے ان دونوں کو بے ہوشی

کی نیند سُلایا تھا وُہ پھر اُن کو بیہوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی طرح جنہوں نے پہلے اس شراب کے پیالے کا ایک گھونٹ پیا تھا وُہ اب اس کا نشہ اُتارنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

قوم کسی ظالم حکومت یا فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کرتی ہے بیدار ہونے اور آزادی حاصل کرنے کے بُلند ارادے سے کر اصلاحی انجمن کی بنیاد ڈال دیتی ہے، پُوری شجاعت اور بہادری سے تقریریں ہوتیں اور اعلانات شائع ہوتے ہیں۔ اخبارات و رسائل جاری ہوتے ہیں اور مُلک کے گوشے گوشے میں وفد بھیجے جاتے ہیں لیکن مہینہ دو مہینے گذرنے نہیں پاتے کہ قوم سُنتی ہے کہ جمعیّت کا صدر یا تو گرفتار کر لیا جاتا ہے یا اسے حکومت کی طرف سے وظیفہ ملنا شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد اصلاحی انجمن کا نام سُننے میں نہیں آتا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے ارکان اپنی عادت کے مطابق نشیلی دوا پی کر سکون و اطمینان کی حالت میں بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی ایک جماعت اُٹھتی ہے وُہ اپنے مذہبی پیشوا کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتی ہے۔ اس کی ذات پر تنقید کرتی ہے۔ اس کے اعمال کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کی کارروائیوں کو بُری نگاہ سے دیکھتی ہے۔ پھر اس

کو ڈراتی ہے کہ وہ ایسے مذہب کو اختیار کرلینگے جو اس کے اوہام وخرافات
کے بالکل خلاف اور عقل کے موافق ہے۔ لیکن بہت تھوڑے دنوں کے بعد ہم
سُنتے ہیں کہ اس مُلک کے خیر خواہوں نے کوشش کر کے قوم اور اس کے پیشوا
کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو ختم کر دیا ہے اور جادو اثر تمثیلی باتوں
کے اثر سے اسی پیشوا کا زائل شُدہ وقار از سرِ نو قوم کے دلوں میں پیدا کر دیا ہے
اور قوم پھر اسی پیشوا کی اندھی تقلید کرنے لگی۔

کمزور اور بے بس انسان کسی ظالم وجابر کے ظلم کی شکایت کرنے لگتا ہے
تو اس کا پڑوسی اسے کہتا ہے کہ خاموش رہو۔ اس لئے کہ جب آنکھ تیر کا مقابلہ کرنے
پر آتی ہے وہ پھوڑ دی جاتی ہے۔

دیہاتی انسان، گوشہ نشین زاہدوں کے اخلاق وتقویٰ کو شک کی
نگاہوں سے دیکھتا ہے تو اس کا ساتھی اسے مخاطب کر کے کہتا ہے کہ زبان سے
کوئی لفظ نہ نکالنا۔ کتاب میں آیا ہے کہ ان کی باتیں تو سُن لیا کرو لیکن ان کے
اعمال سے دُور دُور رہو۔

ایک شاگرد بصریوں اور کوفیوں کے نحوی مناظروں کو بے کار سمجھ کر اس
میں وقت ضائع کرنے سے پہلو بچا کر نکل جانا چاہتا ہے تو اس کا اُستاد اُسے

ڈانٹ کر کہتا ہے کہ نہ بری طرح کاہل اور سست لوگ عذرِ گناہ بدتر از گناہ قسم کے بہانے تراش لیا کرتے ہیں۔

جب کوئی لڑکی بوڑھی عورتوں کی پرانی عادات کی تقلید نہیں کرتی نولعل کی ماں اسے کہتی ہے کہ تو مجھ سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ تجھے لازم ہے کہ اسی راہ پر چلو جس پر میں چلتی ہوں۔

نوجوان اٹھ کر مذہب میں انسان کی طرف سے بڑھائی باتوں کی تحقیق کرنا چاہتا ہے تو زاہدِ خشک اسے یہ کہہ کر چپ کراتا ہے کہ جو شخص ہر مذہبی حکم کو ایمان و یقین کی آنکھ سے نہیں دیکھے گا اسے اس دنیا میں دھند اور غبار کے سوا کچھ نظر نہیں آئیگا۔

اسی طرح زمانے کے دن رات گذرتے ہیں اور مشرق کا باشندہ اپنے نرم بستر پر غفلت میں پڑا کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ جب اسے مچھر کاٹتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں کھول تو دیتا ہے لیکن پھر وہی غفلت اس پر طاری ہو جاتی ہے اور انہیں نشہ آور دواؤں کے اثر سے جو اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہیں اسی طرح مست پڑا رہتا ہے۔ جب کبھی کوئی انسان اٹھتا ہے اور ان سونے والوں کو پکارتا ہے۔ ان کے گھروں، عبادتگاہوں اور

دفتروں کو اپنی چیخ و پکار سے بھر دیتا ہے تو وُہ دائمی خمار سے بند رہنے والی پلکوں کو کھول کر جماہیاں لے لے کر کہتے ہیں۔ "یہ کیسا انسان ہے جو نہ خود سوتا ہے نہ اوروں کو سونے دیتا ہے" اتنا کہہ کر وُہ پھر اپنی آنکھیں بند کر کے اپنی رُوح سے کہتے ہیں "یہ انسان کافر ہے۔ مُلحد ہے۔ یہ نوجوانوں کے اخلاق خراب کرنے کے درپے ہے، یہ قوم کی بُنیادوں کو گرا دینا اور انسانیت کو زہریلے تیروں سے چھلنی کرنا چاہتا ہے۔"

مَیں نے کئی بار اپنے نفس سے پُوچھا کہ کیا وُہ ان سرکش جاگنے والوں میں سے تو نہیں جو سکون بخش اور نشہ آور دواؤں کے پینے پر رضامند نہیں لیکن نفس مجھے ہمیشہ گول مول جواب دیتا۔ مگر جب مَیں نے دیکھا کہ لوگ میرا نام لے کر مجھے کوستے ہیں اور میری تعلیمات کو سُن سُن کر وہ کراہتے ہیں۔ اُس وقت مجھے اپنی بیداری کا یقین آگیا اور مَیں جان گیا کہ مَیں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے آپ کو شیریں اور لذیذ خوابوں اور سکون پذیر خیالات کے سپرد کر دیں بلکہ میں ان تنہائی پسند انسانوں کا ایک جزو ہوں۔ جن کو زندگی تنگ اور پُرخار وادیوں میں گھسیٹے لیے جاتی ہے۔ ایسی وادیاں

جو چھٹنے والے بھیڑیوں اور میٹھی بولی بولنے والی بلبلوں سے معمور ہو۔
اگر یہ بیداری کوئی فضیلت ہوتی تو میری تنگدلی مجھے اس سے یقیناً روکتی۔ لیکن یہ کوئی فضیلت ہے ہی نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو تنہائی پسند افراد پر ان کی غفلت میں ظاہر ہوتی ہے اور ان کے آگے آگے چلتی ہے۔ وہ لوگ اپنے ارادے کے خلاف اس کے پیچھے چلتے ہیں۔ اس کی پوشیدہ کشش سے وہ کھنچے چلے جاتے ہیں اور اس کے ہیبتناک معانی کی طرف پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔
میرا تو یہ خیال ہے کہ شخصی حقائق کے اظہار میں ایک قسم کی ریا ہے جسے مشرق کے باشندوں کی زبان میں تہذیب کہا جاتا ہے۔

کل "مفکر" اور "ادیب" میرے ان گذشتہ خیالات کو پڑھ کر غصے سے کہیں گے۔ "یہ حد سے تجاوز کر چکا ہے۔ یہ زندگی کے تاریک پہلو ہی کو دیکھتا ہے اور اسی وجہ سے اسے تاریکی کے سوا کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ یہ تو اس سے پہلے بھی بہت مرتبہ ہمارے درمیان کھڑا ہو کر پکارتا رہا ہے ہماری حالت پر روتا اور افسوس کرتا رہا ہے۔"

ان منفکرین سے میں کہتا ہُوں مَیں مشرق کا نوحہ اِس لئے کرتا ہُوں کہ مُردہ لاش کے سامنے ناچنا جنون ہے۔

مَیں اہلِ مشرق پر اس لئے روتا ہُوں کہ امراض کی وجہ سے ہنسنا جہل ہے۔

مَیں اپنے پیارے وطن کا سوگ اس لئے مناتا ہوں کہ مصیبت کے وقت گانا بے عقلی ہے۔

مَیں اس لئے حد سے تجاوز کر رہا ہُوں کہ جو شخص حق کے ظاہر کرنے میں اعتدال سے کام لیتا ہے وُہ حق کی آدھی بات کو تو ظاہر کر دیتا ہے لیکن باقی آدھی لوگوں کی بدگمانیوں اور اُن کی باتوں کے خوف سے پوشیدہ رہ جاتی ہے۔

مَیں سڑی ہوئی لاش دیکھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں میرا دل بے چین ہو جاتا ہے اور میرے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ میں دائیں ہاتھ میں شراب کا پیالہ اور بائیں میں مٹھائی کی ڈلی لے کر اس کے سامنے بیٹھ جاؤں۔

اگر وہاں کوئی ایسا ہے جو میرے رونے کو ہنسی، میرے خوف کو رحم اور میری افراط کو اعتدال سے بدلنا چاہے تو اُسے چاہیئے کہ وُہ مجھے تمام اہلِ

مشرق میں کوئی ایک انصاف پسند، عامل شرع، راست رو حاکم بتائے مجھے کوئی مذہبی پیشوا دکھائے جو اپنے علم کے ساتھ عمل بھی کرتا ہو اور مجھے کسی ایسے شوہر کا پتہ دے جو اپنی بیوی کو اُسی آنکھ سے دیکھتا ہو جس سے وُہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔

اگر کوئی ایسا ہے جو چاہے کہ مجھے خوشی سے ناچتا اور طبل و سارنگی سے کھیلتا ہوا دیکھے تو اُسے چاہئے کہ وُہ مجھے شادی والے گھر بلائے نہ کہ قبرستان میں کھڑا کر دے۔

ظاہر و باطن

مَیں نے جب کبھی کوئی کڑوا پیالہ پیا، اُس کی تلچھٹ شہد کی طرح شیریں نکلی۔

میں جب بھی کسی دشوار گذار گھاٹی پر چڑھا۔ بالآخر ایک سبزہ زار پر پہنچا۔

مَیں جب بھی شام کے دھندلکے میں کسی دوست کو کھو بیٹھا تو صبح کی روشنی میں اس کو دوبارہ پالیا۔

بسا اوقات اجر و ثواب کے خیال سے مَیں نے اپنے آرام و مصائب

کو اظہارِ شجاعت کے پردے میں چھپایا۔ لیکن پردہ اُٹھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ آلام مسرتوں سے اور مصائب جسم کی ٹھنڈک اور سلامتی سے بدل گئے ہیں۔

ایسے ہی بہت مرتبہ میں نے اپنے کسی دوست کے ظاہری عادات و خصائل کو دیکھ کر اسے پرلے درجے کا احمق اور بیوقوف سمجھا لیکن جب حقیقت سامنے آئی تو میں نے اپنے آپ کو خونخوار ظالم اور اُسے خوش طبع حکیم پایا۔

اسی طرح بسا اوقات خود بینی کے نشے میں مست ہو کر میں یہ سمجھتا رہا کہ میں بھیڑ کا کمزور بچہ ہوں اور میرا ساتھی خونخوار بھیڑیا ہے لیکن جب نشے کی وہ کیفیت اُتر گئی تو میں نے دیکھا کہ ہم دونوں انسان ہی ہیں۔

لوگو! میں اور تم صرف اپنی ظاہری حالت پر نگاہ رکھتے ہیں اور حقیقت سے آنکھیں بند کرنے کے عادی ہیں۔ اگر کسی کے قدم میں ذرا لغزش آتی ہے تو ہم پکار اُٹھتے ہیں کہ بس یہ تو گو گیا۔ اور اگر کوئی احتیاط سے پھونک کر قدم اُٹھاتا ہے تو ہم یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ بزدل اور جلد ہلاک ہونے والا ہے۔ اگر کوئی غور و فکر سے کام لیتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ گونگا جاہل ہے اگر کوئی آہ و زاری کرنے لگ جاتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نزع کی ہچکیاں

ہیں اب یہ زندہ نہیں بچ سکتا۔

ہم سب "من و تو" کے ظاہری پوست میں چھپے ہوئے ہیں یہی ہے کہ روح نے جو اسرار "من و تو" کے الفاظ میں پوشیدہ رکھ دیئے ہیں ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔

غرور و تکبر نے ہمیں ان سچائیوں کی دریافت سے روک رکھا ہے جو ہمارے اندر پوشیدہ ہیں۔

میں تم سے کہتا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ میری بات بھی ایسی ہو جو میری حقیقت کو چھپانے والی ہو لیکن میں تم سے اور خود اپنے نفس سے کہتا ہوں کہ ہم اپنی ظاہری آنکھوں سے جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی حقیقت اس بادل سے زیادہ نہیں جو سامنے آکر ان چیزوں کو چھپا لیتا ہے جن کو بصیرت کی آنکھوں سے دیکھنا میرے لئے ضروری ہوا کرتا ہے اور جو آواز ہمارے کانوں میں آتی ہے اس کی حقیقت اس گونج سے زیادہ نہیں جو اس آواز کے آڑے آتی ہے جس کو دل سے یاد رکھنا ہم پر لازم ہوتا ہے اگر ہم کسی سپاہی کو دیکھیں کہ وہ کسی آدمی کو جیل کی طرف گھسیٹ رہا ہے تو ہم پر لازم ہے کہ ہم فوراً ان دونوں میں سے صرف ایک کو مجرم نہ سمجھیں

اور اگر ہم دیکھیں کہ ایک انسان اپنے خون میں لتھڑا ہوا پڑا رہے اور دوسرے
کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں تو عقلمندی یہ ہے کہ ہم فوراً ایک کو قاتل
اور دوسرے کو مقتول نہ سمجھ لیں اور اگر ہم دیکھیں کہ ایک آدمی گا رہا ہے اور
دوسرا دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے تو ہمیں چاہئے کہ کچھ دیر انتظار کریں تاکہ
معلوم ہو جائے کہ کون خوش ہے ؟

(بھائی! ہمیشہ کسی کی ظاہری حالت سے اس کی حقیقت کا اندازہ
نہ لگایا کرو اور کسی کی بات یا کسی کے ظاہری عمل کو اس کے چھپے ہوئے
اسرار کا عنوان نہ ٹھہراؤ۔ اس لئے کہ دنیا میں ایسے بہت سے انسان ہیں
جن کو زبان کی تتلاہٹ اور لہجے کی خرابی کی وجہ سے تم جاہل سمجھتے ہوگے
لیکن اس کا وجدان، ذکاوت کی ایک شاہراہ اور اس کا دل وحی کی
جائے نزول ہو گی۔ بہت سے ایسے بھی ہونگے جن کے چہرے کی بدزیبی
اور اُن کی تنگدستی کی وجہ سے تم ان کو حقیر سمجھتے ہو لیکن دراصل وہ زمین پر
آسمان کی عنایات میں سے ایک بخشش اور لوگوں میں خدا کی پیدا کردہ
سعید روح کی حیثیت رکھتے ہونگے)

تم ایک ہی دم عالیشان محل سے مرعوب ہو جاتے ہو اور ایک

غریب کے تنگ و تاریک جھونپڑے کو رحم اور شفقت کے جذبات سے دیکھتے ہو۔ لیکن اگر تم اس پر قادر ہوتے کہ ظاہری حالات سے حواس کو متاثر نہ ہونے دیتے تو تمہارا خوف سکڑ کر افسوس کے آسمان پر چڑھ جاتا اور تمہاری شفقت تبدیل ہو کر جلال کے رتبے تک پہنچ جاتی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم اپنی زندگی کے صبح و شام میں دو مختلف آدمیوں سے ملتے ہو۔ ایک تم سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے کہ اس کی آواز میں آندھی کی گونج ہے اور اس کی حرکات میں ایک جرار فوج کا رُعب ہے لیکن دوسرا آدمی تم سے ڈرتے ڈرتے ہچکچاتی ہوئی آواز میں غیر مرتب گفتگو کرتا ہے۔ تم پہلے آدمی کو بہادر اور عزم صمیم رکھنے والا اور دُوسرے کو ڈرپوک اور بُزدل سمجھنے لگ جاتے ہو۔ لیکن اگر تم دونوں کو اس وقت دیکھتے جب زمانہ انہیں سختیوں کے برداشت کرنے اور کسی مقصد کے لئے جان دینے کو بُلا رہا تھا تو معلوم ہو جاتا کہ کُھلی بے حیائی کا نام شجاعت اور خاموش حیا کا نام بُزدلی نہیں ہے۔

گھر کی کھڑکی سے جھانکتے ہُوئے تمہاری نگاہ سڑک کے ایک طرف سمٹ سمٹ کر چلنے والی پارسا عورت اور دوسری طرف اکڑ کر جانے والی

فاحشہ پر پڑتی ہے۔ تم فوراً دل میں کہنے لگ جاتے ہو کہ یہ ایک کتنی شریف اور وُہ دُوسری کتنی ذلیل ہے۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے آنکھوں کو بند کر کے دل کی آواز سُننے کی کوشش کرو تو فضا کے ہر ذرہ سے کانوں میں یہ آواز آتی کہ یہ ایک مُبری تعریف نماز کے ذریعہ کرتی ہے لیکن وُہ دوسری تکلیف میں رہ کر بھی مجھ ہی سے اُمید لگائے بیٹھی ہے اور ان دونوں کی روحوں میں میری رُوح کی جھلک نظر آرہی ہے۔"

تم تمدن اور ترقی کی تلاش میں چکر لگاتے لگاتے کبھی ایسے شہر میں داخل ہو جاتے ہو جس کے محل آسمان سے باتیں کرتے ہیں، شاندار عمارتیں موجود ہیں۔ چوڑی چوڑی صاف سڑکوں پر لوگ اِدھر اُدھر بھاگے پھرتے ہیں۔ ان کی اکڑ کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وُہ زمین کو پھاڑ دینے' فضا میں اُڑنے۔ بجلی کو اُچک لینے اور ہوا سے باتیں کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان کے زرق برق لباس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے لئے ع

ہر روز روزِ عید' ہر شب شب برات

اسی تمدن کی تلاش میں تھوڑے ہی دن بعد تم کسی اور ایسے شہر میں پہنچ جاتے ہو جس کے مکانات خستہ حالت میں ہیں جس کی گلیاں

تنگ و تاریک ہیں۔ بارش کے دنوں میں وہی مکانات کیچڑ کے سمندر میں مٹی کے جزیرے معلوم ہوتے ہیں اور اگر ان پر کڑاکے کی دھوپ پڑتی ہے تو وہ گرد کے بادل معلوم ہوتے ہیں ان میں بسنے والے انسان ابھی تک بے تکلفی اور سادگی کے درمیان ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کمان کے دونوں سروں کے درمیان ڈھیلا تانا وہ آہستہ آہستہ چلتے پھرتے ہیں اور بہت سستی سے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ وہ تمہاری طرف یوں دیکھتے ہیں گویا ان کی آنکھوں کے پیچھے اور ایسی آنکھیں ہیں جو تم سے دُور کسی چیز کو گھور کر دیکھ رہی ہیں تم ان کے گندے شہر سے غم و غصّہ کے جذبات لئے ہوئے نکلتے ہو اور دل میں کہتے ہو" زندگی اور موت میں وہی فرق ہے جو میں نے اس گندے شہر اور اس صاف ستھرے شہر میں دیکھا۔ وہاں ہر چیز میں قوت کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں اور یہاں ہر چیز پر ضعف اور بزدلی چھائی ہوتی ہے اُدھر گرمی اور بہار کے موسم کی چہل پہل نظر آتی ہے اور ادھر خزاں اور سردی کی سی پژمردگی چھائی ہوتی ہے۔ وہاں پر عزم صمیم اور جوانی ہے جو باغوں میں ناچتی پھرتی ہے اور یہاں —— کمزوری —— اور بڑھاپا ہے جو ریت میں لنھڑا پڑا ہے۔

لیکن اگر تم اللہ تعالےٰ کے دیئے ہوئے نور سے ان دونوں شہروں کی طرف دیکھنے کی قدرت رکھتے تو ان دونوں کو ایک باغ کے ایک ہی قسم کے دو درختوں کی شکل میں پاتے۔ اور اگر تمہاری نگاہ اور آگے بڑھ کر تمہیں ان کی حقیقت تک پہنچاتی تو تم دیکھتے کہ متمدّن شہر کی بلند عمارتیں جلد مٹ جانے والے پانی کے چمکدار بلبلے ہیں اور غیر متمدّن شہر کے اُجڑے ہوئے جھونپڑے پوشیدہ اور پائیدار جوہر ہیں۔

نہیں۔ زندگی نظر آنے والی سطحی چیزوں کا نام نہیں بلکہ وہ پوشیدہ حقائق کا نام ہے جو ظاہری پوست سے نظر آنے والی چیز نہیں بلکہ پوست کے اندر محفوظ مغز کا نام ہے اور انسان چہروں سے نہیں بلکہ دلوں سے پہچانے جاتے ہیں۔

(اسی طرح مذہب عبادتگاہوں کا اور تقلیدی نظام کا نام نہیں بلکہ عبارت ہے اُن عقائد سے جو دلوں میں پوشیدہ رہتے ہیں اور ارادوں میں بستے ہیں۔)

اسی طرح فن اُس آواز کا نام نہیں جو مُغنّی زیر و بم کی شکل میں کان تک پہنچائے یا جو قصیدہ خوانی کی لہروں کی صورت سُنی جائے۔ نہ رنگ

بلکہ لکیروں کا نام بھی نہیں جو تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ بلکہ فن وُہ لرزتے ہُوئے خاموش فاصلے ہیں جو گانے کے زیر و بم کے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر کی رُوح میں بسنے والی نامانوس خاموشی اور طمانیت جو بہرے جو قصیدے کے واسطے سے کانوں تک پہنچے۔ اُس حُسن کا نام ہے جو حسین شکل کی طرف دیکھنے سے تمہیں دُور رہتے ہُوئے بھی اپنی طرف کھینچتا ہے۔

بھائی! زمانہ کے لیل و نہار ظاہری رات دن کا نام نہیں وہ بیں لیل و نہار کے فاصلے کے ساتھ چلنے والا انسان میری حقیقت صرف اتنی ہی باتوں میں پوشیدہ نہیں جو میں تمہاری سمجھ کے مطابق بیان کرتا ہوں۔

اس لئے مجھے میری حقیقت کو آزمانے سے پہلے جاہل نہ سمجھ لو۔ مجھے میری اُس ذات کے موجودہ تصوّر کو علیحدہ کرنے سے قبل نام سے برتر خیال نہ کر لو۔ میرے دل کو دیکھنے سے پہلے مجھے بخیل اور کنجوس کہہ کر نہ پکارو۔ اور اسی طرح میری جود و سخا کے اسباب کو معلوم کرنے سے قبل مجھے سخی اور فیاض مت سمجھ لو۔ میری محبّت کے نُور اور اس کی آگ کو اچھی طرح آزمانے سے پہلے مجھے اپنا دوست کہہ کر نہ پکارو اور میرے رِستے ہوئے ناسور کو اچھی طرح چھُونے بغیر مجھ پر یہ الزام بھی نہ لگاؤ کہ میرا دل محبّت سے خالی ہے

ممالکِ عربیّہ کی بیداری

سوال:- آپکے خیال میں ممالکِ عربیہ کی بیداری کسی ایسی مضبوط بُنیاد پر قائم ہے جس کی وجہ سے یہ دائمی صُورت اختیار کریگی یا یہ ایک وقتی جوش ہے جو بہت جلد ختم ہو جائیگا۔

جواب:- میرا خیال تو یہ ہے کہ ممالکِ عربیہ کی موجودہ بیداری ایک مدھم سی صدائے بازگشت سے زیادہ نہیں جو جدید مغربی تمدّن کی پیداوار ہے اور یہ اس لئے کہ اس بیداری نے خود عربی ممالک میں کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی اور نہ ہی اپنی ان خصوصیّات کو ظاہر کیا ہے۔ جو صرف اُن ممالک سے مختص ہیں

وُہ اسفنج جو باہر سے تھوڑا سا پانی مستعار لے کر پھُول جاتا ہے کبھی پانی کے بہتے ہُوئے چشمے میں تبدیل نہیں ہوتا لیکن جو شخص یہی سمجھتا ہے کہ اسفنج میں سے چشمہ پھُوٹتا ہے تو اُسے راقم الحروف کے اجتماعی نظریوں کی نسبت کسی حکیم کی جڑی بوٹیوں کی زیادہ ضرورت ہے۔

دو سمندروں کے درمیان پھیلا ہُوا وسیع و عریض مشرق آج کل مغرب اور اہلِ مغرب کی نو آبادی بن گیا ہے لیکن مشرق کے باشندے، وُہ باشندے جو اپنے ماضی پر فخر کرتے ہیں، جو اپنے آثار پر اکڑتے ہیں اور اپنے آبا و اجداد کے کارناموں ہی کو فخر سے یاد کرتے رہتے ہیں، ان کے افکار اہلِ مغرب کے افکار، ان کے میلانات مغرب کے میلانات اور ان کے جذبات اہلِ مغرب کے جذبات کے خوشہ چیں بن کر رہ گئے ہیں۔

ہمیں مغربی تمدّن کی خوبی یا اس کی خرابی سے بحث نہیں۔ اس لئے کہ مغربی تمدّن ۱۹۱۴ء میں آپ ہی قضاءِ خداوندی کی لپیٹ میں آیا ہُوا ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ دائمی طور پر وُہ اسی لپیٹ میں رہیگا۔ اگر قضاءِ خداوندی مغربی تمدّن کا فیصلہ سُنانے کے لئے مجھے اپنا نائب بناتی تو میں ایسا فیصلہ سُناتا اور مغرب کے اکثر مفکّرین کے فیصلے سے میرا فیصلہ اتفاق کرتا۔

اس وقت بحث یہ ہے کہ کیا ممالکِ عربیہ میں بیداری پیدا بھی ہوئی ہے یا نہیں اور یہ کہ "بیداری" کے لفظ کے کون کون سے معنی ہو سکتے ہیں اور ہر معنی کے اعتبار سے اس سے کیا کیا نتائج مترتب ہوتے ہیں۔

اگر "بیداری" کسی اُستاد کی شاگردی اور شاگرد کے سطحی اقتباس کا نام ہے تو اس لحاظ سے ممالکِ عربیہ میں اس وقت بیداری پیدا ہو چکی ہے۔

اگر "بیداری" بوسیدہ کپڑوں میں پیوند لگانے کا نام ہے تو ممالک عربیہ کو اس لحاظ سے تمام ممالک پر فوقیت حاصل ہے۔

اگر "بیداری" اس کا نام ہے کہ کوئی جماعت دوسروں کا اُتارا ہوا بیکار لباس پہن لے تو ممالکِ عربیہ اس مقصد کو حاصل کر چکے ہیں۔

اگر "بیداری" سیاہ چیز پر سفید رنگ چڑھانے، گرتی ہوئی عمارت کو چونا لگانے اور مسمار شدہ کھنڈر کی مرمت کو کہتے ہیں تو ممالکِ عربیہ شرافت اور سربلندی کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ چکے ہیں۔

اگر "بیداری" اس کا نام ہے کہ ہم جہالت کی خوردبین لگا کر چیونٹی کو ہاتھی اور مچھر کو اونٹ سمجھیں تو ممالکِ عربیہ یقیناً بیداری کی دولت سے مالامال ہو چکے ہیں۔

اگر "بیداری" اس کا نام ہے کہ اعلٰے نصب العین سے اس لئے مُنہ پھیر لیں کہ اس کا حاصل کرنا دشوار ہے اور صبر و رضا کی زندگی اختیار کر لیں اس لیئے کہ یہی آسانی کا راستہ ہے تو ممالکِ عربیّہ زمانے کے انقلابات سے محفوظ ہو چُکے ہیں۔

لیکن اگر "بیداری" ایجاد و اختراع کا نام ہو تو ماننا پڑیگا کہ ممالکِ عربیّہ اس وقت بھی خوابِ غفلت میں ہیں۔

اگر "بیداری" رُوح اور انسانی جوہر کی بیداری کا نام ہے تو ممالکِ عربیّہ کی رُوح اور ان کا جوہر اس وقت اُسی منزل پر ہے جس پر وہ آج سے ایک ہزار سال قبل تھا۔

اگر "بیداری" حقیقی بیداری، باطنی معرفت اور خاموش شعور کا نام ہو تو مشرق ابھی اُٹھا نہیں اس لیئے کہ وہ کبھی گرا ہی نہیں۔ قدرت کے وہ مدفون خزانے جن کی کھوج نکالنے کی کوشش انہی ممالک نے کی وہ مفقود نہیں ہُوئے بلکہ خود انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ موتیوں کا وہ درخت جس کو مشرق نے اپنی پاک مٹی میں لگایا اور اسے اپنے آنسوؤں اور اپنے خون سے سیراب کیا اس کی شاخیں اب بھی سرسبز اور پھلوں سے لدی ہُوئی

ہیں مگر مشرق نے اپنا رُخ اس سے پھیر لیا اور دُوسرے درخت کے سائے میں آ گیا۔

اگر یہ ہو سکتا کہ ہم تھوڑی دیر کیلئے تنہائی کی کسی بلند چوٹی پر چڑھتے اور ماضی کے واقعات ہمارے سامنے ایک ایک کر کے گذرتے تو ہم دیکھتے کہ قوموں کی بیداری اور اُن کی ترقّی ان کارناموں سے نہیں ہوتی جو انہوں نے صرف اپنے نفع کے لئے سرانجام دیئے اور جن کے ذریعہ انہوں نے صرف اپنے ممالک اور حدود کی عظمت بڑھائی بلکہ ترقی ان کارناموں کی وجہ سے تھی جو بعد میں آنے والی تمام قوموں کے لئے بطور یادگار باقی رہے۔ زمانے کا وُہ بچوڑ جس کی صبح بابل میں اور شام نیو یارک میں ہوا اس کا پس منظر وُہ حقائق ہیں جن کو انسانوں نے دریافت کیا اور جو تمام انسانی افراد کیلئے عام تھے ان کا سرچشمہ وُہ جمالِ مطلق ہے جس کو انسان نے دیکھا، اسے ایک لاجواب قالب میں ڈھالا اور آخر سونے کے لاٹھ کی صورت میں سُورج کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اگر ہم روحانی بیداری کا ذکر کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ موسیٰ (علیہ السّلام) بنی اسرائیل کی بیداری تھی۔ موسیٰ (علیہ السّلام) ہمیشہ بیدار رہتے اور بیدار رہے۔ بُدھ ہندوستان کی بیداری تھی۔ بدھ بیدار

تھا اور بیدار رہا۔ یسوع مسیح علیہ السّلام ان لوگوں کی بیداری تھی جن کی نہ کوئی قومیت تھی اور نہ ہی کوئی وطن اور مسیح علیہ السّلام ہمیشہ بیدار تھے اور بیدار رہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عرب کی بیداری تھی اور وہ ہمیشہ بیدار تھے اور بیدار رہے۔

اگر ہم فن و ادب کی طرف میلان رکھتے ہوں —— اور فن و ادب کا درجہ دین کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا شرح کا متن سے —— تو ان آسمانی بیداریوں کے اشارے ہمیں لحن داؤدی میں، ایوب کی کتاب میں، ہندی حکایات میں، چینی ضرب المثلوں میں، حضرت علی کے مقولوں میں، غزالی کے نظریات میں، ابن فارض کے کلام میں، معرّی کے فلسفے میں، ڈینٹے (DANTE) کے خوابوں میں، میکل انجلو (MICHAEL ANGELO) اور شکسپیر (SHAKESPEARE) کے ڈراموں میں کھلے طور پر چمکتے ہوئے نظر آئیں گے۔

اگر ہم علوم فلسفیہ میں غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ باوجود اس کے کہ ہر دَور اپنے پیش رو زمانے کی یادگاروں کو گرا دینے کی کوشش کرتا ہے پھر بھی ان میں سے اتنا حصّہ ضرور باقی رہ جاتا ہے جس سے انسانی افراد

مستفید ہوتے ہیں لیکن جب ہم جالینوس سے لے کر لسٹر تک، اقلیداس سے لے کر آئن سٹان تک اور یعقوب کندی سے لے کر پاسٹر تک ان تمام افراد کی حقیقت تلاش کریں جو علوم طبیعیہ اور علوم فلسفیہ میں منہمک رہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان میں کا ہر فرد اپنے جماعتی فہم میں پوشیدہ عزم کا ایک مجسّمہ تھا۔ کسی دوسری جماعت کی عقلیت میں لرزتا ہوا سایہ ہرگز نہ تھا۔

ان باتوں سے معلوم ہوا کہ بیداری کا دار و مدار اپنی اصل پر ہوا کرتا ہے۔ اس سے پھوٹی ہوئی شاخوں پر نہیں۔ اس کا جوہر ثابت ہوا کرتا ہے بدلتے ہوئے اعراض پر نہیں۔ الہام کے ذریعہ حاصل کی ہوئی زندگی کے اسرار پر ہوا کرتا ہے۔ وقتی لذتوں سے متعلق فکری تخیلات پر نہیں، ایجاد کنندہ رُوح پر ہوا کرتا ہے۔ تقلیدی مہارت پر نہیں۔ اس لئے کہ رُوح ہی باقی رہنے والی چیز ہے اور رُوح کی بیان کردہ حقیقت بھی۔ لیکن تقلیدی مہارت صاف شُدہ اور جلد مٹ جانے والے چھلکے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور اس کے صاف شُدہ چھلکے پر جو بھی عکس ڈالا جائیگا۔ وُہ خیالی چیز کی طرح مٹ کر فنا ہو جائیگا۔

اگر یہ ساری باتیں ماننے کے قابل ہیں —— اور ضرور ہیں ——

تو میرے خیال میں یہ بات صاف ظاہر ہوگئی۔ کہ ممالکِ عربیّہ کے متعلق اُس وقت تک بیداری کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کہ ان کی بیداری کا دارومدار جدید مغربی تمدّن کی تقلید پر ہے ——— وہ مغربی تمدّن جس کو خود اس کے عقلمند فرزند بھی مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس کے اکثر مظاہر کو ناپسندیدہ نگاہوں سے گھورتے ہیں۔

لیکن جب ممالکِ عربیّہ اس کوری تقلید سے باز آ کر اپنی خاص قوّتوں کو بیدار کرلیں۔ کمر باندھ کر اپنے قدیم پوشیدہ خزانوں کے سامنے آ کھڑے ہوں تو اُس وقت وہ حقیقت میں بیدار ہونگے۔ ان کی بیداری مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگی اور وہ فوری جوش نہیں ہوگا جو جلد ٹھنڈا پڑ جائے۔

سوال:۔ کیا آپ کی رائے میں ممالکِ عربیّہ کا ایک دوسرے سے متفق ہونا ممکن ہے اور اگر ہے تو کب تک اور کن کن اسباب سے؟ اس اتحاد میں زبان کا حصّہ کیا ہوگا؟

جواب:۔ یہ سوال سیاسی عروج سے متعلّق ہے۔ حقیقی عروج سے اس کا تعلّق تو کوئی نہیں پھر بھی اس کا جواب دینے میں کوئی حرج نہیں

میری رائے یہ ہے کہ موجودہ دَور میں ممالکِ عربیّہ کا متحد ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے کہ مغربی فکر اس بات کا قائل ہے کہ طاقت کا زور حق سے زیادہ ہے اور وُہ قوّت اپنی سامراجی اور سرمایہ دارانہ مفاد کو ہر چیز پر مقدم رکھتی ہے جب تک اس قوّت کے پاس ہر اس طاقت کو ختم کرنے کے لئے منظم فوجیں اور بڑی بڑی توپیں موجود ہیں۔ جو اس کے سامراجی مصالح یا اقتصادی ارادوں میں حائل ہو۔ اس وقت تک یہ اتحاد ناممکن ہے اور ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ یورپ کی تمام قومیں "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور دُنیا کی بدبختی، مشرق اور مغرب کی عمومی بدبختی بھی ہے کہ توپیں افکار سے زیادہ قوی ہوگئی ہیں اور سیاسی حیلے حقائق کی نسبت زیادہ مؤثر بن گئے ہیں۔

آخر ممالکِ عربیّہ کا اتحاد کیسے ممکن ہے جب کہ ان کے ایک ایک مُلک کا مرکزِ حرکت اور اضطراب ہیں تو ہے۔ مگر یہ اضطراب یورپین دار الخلافوں میں سے کسی ایک دار الخلافہ کی ہدایت کے مطابق ہوتا ہے اور وُہ آپس میں متحد کیونکر ہو سکتے ہیں جب کہ ہر مُلک اپنی سیاسی، عمرانی اور اقتصادی نظریات میں مغرب کے کسی بعید گوشے کے اشاروں کو دیکھتا رہتا ہے۔

جب ممالکِ عربیہ کا کوئی ملک چاہے کہ وُہ سیاسی اعتبار سے کسی اور کے حِصّہ مُلک سے مل جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس سے کچھ لے اور اسے کچھ دے اور اگر چاہے کہ انتظامی اعتبار سے اس سے مل جائے تو اس پر لازم ہے کہ اسے اپنے قریب کر دے اور خود اس کے قریب ہو جائے اور اگر چاہے کہ اس سے اقتصادی امداد حاصل کرے تو اس کا فرض ہے کہ اور ممالک کے ساتھ اسی مُلک کے تبادلہ کو ترجیح دے۔ مجھے کوئی بتا سکتا ہے کہ کیا عربی ممالک میں ان ابتدائی باتوں کو بھی کوئی سمجھ چکا ہے ــــــ

ایسی ابتدائی باتیں تو اتحاد کے راستہ میں بہت زیادہ معمولی حیثیت رکھتی ہیں۔ مَیں تو کہتا ہُوں کہ یہ ممالک ابھی ان ابتدائیات سے بھی ناآشنا ہیں اور مَیں اسی لئے کہتا ہُوں کہ ان ابتدائی باتوں کے بعد اس سے زیادہ گہری اور زیادہ مؤثر باتوں سے بھی ان کو اطلاع حاصل کرنی پڑیگی۔

مجھے عربی ممالک کے سمجھدار لوگوں میں سے کوئی بتا دے کہ کوئی بھی شامی لین دین کے معاملے میں کسی مصری کو یورپین پر ترجیح دیتا ہے ؟ اور کوئی بھی مصری اس بات کو پسند کرتا ہے کہ یورپ کے باشندوں کو چھوڑ کر مصریوں کے قریب آئے اور کیا حجاز۔ یمن یا عراق کے رہنے والے عربی

کو یہ بات پسند ہے کہ وہ مغرب کے باشندے سے پہلے کسی مصری یا شامی سے معاملہ کرے؟

مجھے دُنیا کا کوئی عاقل یہ بتا دے کہ کیا اقتصادی اتحاد بلکہ اقتصادی استقلال سے پہلے سیاسی یا غیر سیاسی اتحاد ممکن ہے؟

اور اس کے بعد عرب کے متکلمین، امراء اور عوام کے لیڈر مجھے بتائیں کہ کیا وہ واقعی ممالکِ عربیہ کی بیداری، ان کے اتحاد اور ان کے استقلال کے خواہشمند ہیں جب کہ انہوں نے اس راستے میں اپنی ناقابلِ فہم اور ناقابلِ عمل رایوں کے سوا ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا۔ اور اگر ان کے خاص اعمال، ان کے ذاتی افعال اور ان کی روزمرّہ زندگی پر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آئیگا کہ وہ اپنے ارادوں اور اپنے دعووں کے خلاف چل رہے ہیں۔ وہ مغربی برتنوں میں کھاتے ہیں۔ مغربی پیالوں سے پیتے ہیں مغربی لباس پہنتے ہیں، مغربی تکیوں پر سر رکھکر سوتے ہیں اور یہاں تک کہ جب مرتے ہیں تو ان کا کفن تک مغرب کے کارخانوں سے بُن کر آتا ہے۔

کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ قومی رہنما اور سیاسی متکلم جب میرے

پاس ممالکِ عربیّہ کے معاملات پر گفتگو کرنے آتا ہے تو کسی نہ کسی مغربی زبان
میں گفتگو کرنے لگ جاتا ہے؟
کیا رونے کا مقام نہیں کہ مجھے اس لئے اپنے گھر بلایا جاتا ہے کہ مجھے
اس کی مہذّب ــــــ مغربی تہذیب یافتہ ــــــ بیوی کے سامنے سرِ دقد
کھڑے ہونے کا شرف حاصل ہو؟
کیا دل کے خون ہونے کا واقعہ نہیں کہ میں اس کے دسترخوان پر
بیٹھا ہوں اور اس کی حسین لڑکی مجھ سے شوپان کے گیتوں کا تذکرہ
کرتی ہے اور اس کا ادیب لڑکا میرے سامنے ڈی موسے کے قصائد
پڑھتا ہے۔ جیسے کہ ہوا کے ساتھ اُڑنے والی رُوح۔ اور گویا کہ اس نے مجنوں
شریف رضی اور ابن زریق سے متعلق کبھی گفتگو ہی نہیں کی۔
ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے کیوں اس بات پر غصّہ
نہیں آئیگا کہ یہی سیاسی لیڈر مجھے مستقبل کے وسیع میدان میں لے جا کر
مجھ سے یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی سیاسی باتوں کو بلا چون وچرا تسلیم
کر لوں۔ جب وہ ممالکِ عربیہ کے اتحّاد اور اس کے اقتصادی استقلال
کی تجاویز میرے سامنے پیش کرے۔

اگر یہی سیاسی لیڈر جو ایک ہی وقت میں دو کشتیوں پر سوار رہتا ہے مجھ سے ہنس کر بھی کہتا کہ مغرب آگے بڑھ چکا ہے ہم اس کے پیچھے پیچھے چلنے والے لوگ ہیں۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ آگے بڑھنے والے کے نقش قدم پر چلیں اور حرکت کرنے والے کے ساتھ ساتھ ہم بھی حرکت کریں۔ تو میں اسے یہی جواب دیتا۔ تم اچھا کر رہے ہو۔ تم بیشک آگے نکلے ہوئے کے پیچھے لگ جاؤ لیکن خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے جاؤ۔ چلنے والے کے نقش قدم پر چلو اور یہ جھوٹے دعوے نہ کیا کرو کہ تم اس کے پیچھے نہیں جا رہے ہو۔ آگے حرکت کرنے والے کے ساتھ بیشک حرکت کرو لیکن اپنے پیشرو کا اخلاص دل میں رکھو۔ بھٹکے ہوئے سیاسی پردوں کی پناہ میں اس بات کو چھپانے کی کوشش نہ کرو کہ تم اس کے محتاج ہو اور پھر معمولی معمولی باتوں میں اتحاد اتحاد کی رٹ لگانے کا فائدہ کیا ہوگا جبکہ تم اصل میں متحد نہیں ہو سکتے۔ افکار کا اتحاد تمہیں کیا نفع پہنچا سکتا ہے جب کہ تمہارے اعمال متحد نہیں ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ جب تم رات کو سو کر ساری ساری رات اتحاد و اتفاق، جنسی اجتماع اور لسانی روابط کے خواب دیکھتے رہتے ہو اور صبح اٹھتے ہی اپنے بچوں اور اپنی بچیوں کو اہل مغرب کے سکولوں

میں انہیں کے اُستادوں سے انہیں کی کتابیں پڑھنے کے لئے بھیجتے ہو تو
مغرب کے باشندے تمہارا مذاق اُڑاتے ہیں ؛ کیا تم اس سے بے خبر ہو کہ
مغرب کے رہنے والے اس وقت تم پر ہنستے ہیں جب تم سیاسی اور اقتصادی
اتحاد سے رغبت کا اظہار کرتے ہو۔ باوجود اس کے کہ انہیں کے پاس جا کر
ان سے درخواست کرتے ہو کہ وُہ اس سوئی کے بدلے میں جس سے تم اپنے
بچوں کے کپڑے سیتے ہو اور اس کیل کے بدلے میں جو تم اپنے مُردوں کے تابوت
میں ٹھونکتے ہو۔ تمہاری زمین کی کچی پیداوار کو قبول کریں۔

میں اُس سے کہتا ہُوں جو ذرا خوش طبعی سے میری باتیں سُنتا ہے
ان بہروں کے سامنے جو اور تو کیا خود اپنے دلوں کی آواز تک کو نہیں سُن
سکتے۔ میں خاموش رہنا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔ ان کے لئے میرے دل میں رحمت و
شفقت کے جذبات ہیں مگر جس طرح مجھے ان کے کانوں سے کوئی حصّہ
نہیں ملتا اسی طرح میری آواز میں ان کا کوئی حصّہ نہیں۔

ان تمام باتوں سے سلبی صورت میں وُہ بات ظاہر ہو گئی جسے میں
ممالکِ عربیّہ کے اتحاد اور ان کے استقلال کے لئے سب سے زیادہ مؤثر سمجھتا
ہوں —— ایجابی صورت میں اس کے لئے دو بنیادی اصول ہیں۔ پہلا

اصول یہ ہے کہ قوم کے بچوں کو خالص قومی مدارس میں تربیت دی جائے اور ان کو عربی زبان میں علوم و فنون کی تعلیم دی جائے۔ اس سے معنوی محبت اور روحانی استقلال حاصل ہوگا۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ زمین کو زیادہ سے زیادہ زرخیز بناکر اس سے پیداوار حاصل کی جائے اور اس پیداوار سے مشرقی صناعی کے ذریعے ایسی اشیاء مہیا کی جائیں جن کی قوم کو ضرورت ہے یعنی مشرقی لباس مشرقی خوراک اور مشرقی مکان وغیرہ ---- اس سے اقتصادی اتحاد پیدا ہوگا اور یہ ہوتے ہوئے ممالکِ عربیہ سیاسی استقلال سے مالا مال ہونگے۔

سوال :- کیا ممالکِ عربیہ کیلئے یہ مناسب ہے کہ وہ مغربی تمدن کے عناصر کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اگر ہے تو کہاں تک ؟ اور کس مقام پر پہنچکر اس سے فائدہ اٹھائیں ؟

جواب :- میرا خیال ہے کہ مغربی تمدن کو حاصل کرنا یا نہ کرنا محلِ بحث نہیں۔ سوال دراصل یہ ہونا چاہیئے کہ مغربی تمدن کو حاصل کرنے کے بعد مشرق اس کے ساتھ کیا کریگا ؟

مَیں نے تین سال ہوئے یہ کہا تھا کہ مغرب کے باشندے گزشتہ دور میں ہماری پکی ہوئی چیزیں لے کر چباتے تھے اور اس کے کام آنے والے اجزاء کو مغربی شکل میں بدل دیتے تھے لیکن آج کا مشرق مغرب کی پختہ غذا کو لے کر نگل جاتا ہے۔ وُہ غذا کو مشرقی شکل میں بدل دینے کی جگہ خود مغربی شکل اختیار کر جاتا ہے اور یہ ایسی حالت ہے جس سے میں بہت زیادہ ڈرتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے کبھی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق وُہ مردِ ضعیف ہے جس کے سارے دانت گر چکے ہیں اور کبھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ وُہ بچّہ ہے جس کے دانت ابھی نکلے نہیں۔

مَیں نے اپنے آخری تین سالوں میں بیشمار تخیّلات کو خیرباد کہا لیکن یہ خیال ہر وقت میرے دل میں کھٹکتا رہا اور کھٹک رہا ہے جس طرح پہلے اس خیال کے آتے ہی میں ڈر جایا کرتا تھا اب بھی اسی طرح ڈرتا ہوں بلکہ اب تو ایک ایسی حالت سامنے آ گئی ہے جو بہت زیادہ خوفناک اور مایوس کُن ہے اور وُہ یہ کہ ان ایّام میں یورپ تو امریکہ کی تقلید کرنے اور اس کے نقشِ قدم پر قدم رکھنے لگا ہے مگر مشرق ابھی یورپ ہی کی تقلید کر رہا ہے اور اس کی طرف رُخ کئے بھاگا جا رہا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مشرق

ایک امام کی تقلید نہیں کر رہا بلکہ وہ کئی مقلدوں کی تقلید میں مصروف ہے۔ اور کئی سلئے اس پر پڑ رہے ہیں۔ یا یُوں سمجھو کہ مشرق کا اسفنج وہی پانی اپنے پیٹ میں ڈال رہا ہے جو اس کے پاس دُوسرے اسفنج سے نکل کر آتا ہے اور یہ انتہائی کمزوری اور دوسروں پر اندھا دُھند بھروسہ کرنے کی آخری حد ہے بلکہ انتہائی حماقت اور اندھا پن ہے۔ اس لئے کہ مشرق کے باشندے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے والے سائل کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔

اگر مشرق کے باشندوں کے لئے یہ ممکن ہوتا کہ وُہ ان چیزوں کو حاصل کرلیں جن سے وُہ بے خبر ہیں بشرطیکہ وُہ چیزیں ان کی اپنی معلومات کے لئے زہر ہلاہل کا کام نہ دیں تو سب سے پہلا شخص میں ہی ہوتا جو مشرق کو اس کی طرف بُلاتا۔ اگر مشرق کا باشندہ اس بات کی قدرت رکھتا کہ وُہ دوسروں سے وُہ تمام چیزیں عاریت پر لے لے جن کی اسے ضرورت ہے۔ لیکن ان کو اپنی معلومات کی قبر نہ بنائے تو میں اس اخذ، اس حصول اور اس نقل کو اچھا سمجھتا۔

لیکن غور کرنے کے بعد مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ مشرق کے باشندوں

کے نفس میں قیام پذیرائی باریک تاروں والی سارنگی ہے جس کے ہر تار کی آواز مغربی سارنگی کے تاروں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اور مشرق کا باشندہ ان دونوں متضاد آوازوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ بغیر اس کے کہ وہ کسی ایک آواز کو یا دونوں کو بیکار نہ کر دے۔

ہم بسا اوقات سطحی نگاہ رکھنے والوں کو یہ دلیل پیش کرتے ہوئے سنتے ہیں کہ "جاپان نے مغربی تمدن کی روشنی حاصل کی اور اسی وجہ سے وہ کامیاب ہوا۔ آگے بڑھا اور اس کی شان یہاں تک بلند ہوئی کہ وہ دنیا کی اونچی قوموں کی صف میں کھڑا نظر آ رہا ہے۔"

لیکن جاپانی مفکرین، جاپانی اہل الرائے اور جاپانی ادیبوں کی نظر میں جاپان نے اپنے مخصوص تمدن کو اسی وقت خیرباد کہا جب وہ مغربی تمدن کی نقل اتارنے لگا۔ وہ کہتے ہیں کہ جاپانی قوم نے اپنی عقلیت، اپنا سلیقہ، اپنے اخلاق، اپنے فن، اپنی صنعت اور یہاں تک کہ اپنے قلبی سکون و اطمینان کو اسی وقت رخصت کیا جب کہ وہ یورپ اور امریکہ کی تقلید کرنے لگا۔ وہ کہتے ہیں کہ جاپان کی فوجی کامیابیاں حقیقت میں کامرانی نہیں بلکہ نہایت ذلیل معنوی شکست تھی اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان آلاتِ جنگ نے جاپانی تمدن

کے مفید اور بہتر حصے کو ختم کر کے رکھ دیا ہے جن کے تیار کرنے کی صنعت جاپان نے جرمنی اور امریکہ سے سیکھی اور اس صنعت کا پھل ان کو بداخلاقی، بزدلی اور کمینہ پن کے سوا کچھ نہ ملا۔

ہمارے قدیم وطن ——— مشرق ——— میں لامحدود ذخیرے اور خزانے موجود ہیں لیکن وہ بکھرے پڑے ہیں اور گرد و غبار کے پردوں سے پوشیدہ ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغرب کے باشندوں نے فنِ ترتیب کو انتہائی مدارج تک پہنچا دیا ہے اسی وجہ سے اگر وہ اپنے عیوب کو بھی مرتّب کر کے پیش کرتے ہیں تو وہ بھی اچھے نظر آتے ہیں اور اگر وہ اپنی بھلائیوں کو ترتیب دے کر پیش کرتے ہیں تو وہ معجزات نظر آتے ہیں پس اگر ہمیں ان سے کچھ نہ کچھ روشنی حاصل کرنا ضروری ہو تو ہمیں چاہیئے کہ ہم ان سے یہی فن سیکھ لیں لیکن اس شرط پر کہ اس کے سوا ہم ان کی کسی اور بات کی تقلید نہ کریں۔

سب سے بڑے معبد نے اپنی ذات سے نفس کو علیحدہ کیا اور اس کو جمال سے بھر دیا۔

اسی معبود نے اس نفس کو نسیمِ سحر کی بیداری، نا شگفتہ کلیوں کی مہک اور چاندنی کے لطیف نُور سے مالا مال کیا۔

اسی معبود نے اس نفس کو ایک جامِ شراب عطا کرتے ہُوئے کہا۔ "اس جامِ شراب کو صرف اس وقت پیو۔ جب تم ماضی کو فراموش کر دو اور مستقبل سے بے فکر ہو جاؤ"۔ اور غم کا ایک اور پیالہ دیتے ہُوئے کہا:- اور جب کبھی

اس شراب کو پیو گے۔ تمہیں زندگی کی حقیقی مسرّت حاصل ہو گی۔

پھر اس نفس کی رگ رگ میں محبّت کا وہ خون دوڑایا جو استغناء کی پہلی سانس کے ساتھ ختم ہو جایا کرتا ہے اور ایسی مستی اس میں بھر دی جو غرور کے پہلے حملے کے ساتھ اُڑ جایا کرتی ہے۔

اس کو ایسے ملکوتی علم سے مالا مال کیا جو اسے سچّائی کی راہوں پر لگاتا ہے اور اس کے دل کی گہرائیوں میں ایسی بصیرت پیدا کر دی جس سے وہ نظر نہ آنے والے حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے۔

اس میں رحم کے ایسے جذبات بھر دیئے جو خیالات کے ساتھ بہتے ہیں اور رسالیوں کے ساتھ چلتے ہیں۔

اسے ایسا لباس پہنایا جسے فرشتوں نے قوسِ قزح کے رنگین تار و پود سے تیار کیا تھا۔

پھر اس میں حیرت کی تاریکی، جو درحقیقت خیال کی روشنی ہے، بھی رکھ دی اسی معبود نے غضب کی بھٹی سے آگ کے چند شعلے، جہالت کے صحرا میں اُڑتی ہوئی آندھیوں کی ہوا، غرور کے سمندر کے کنارے پڑی ہوئی ریت کی ایک مٹھی، انسان اور زمانے کے قدموں کے نیچے پڑی ہوئی خاک

کو اُٹھایا۔

ان سب کو ملا کر ایک مجموعہ تیار کیا جسے انسی اندھی قوّت عطا کی جو جنون کے وقت بھڑک اُٹھتی ہے اور شہوانی خیالات کے ساتھ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔

اس مجموعہ میں زندگی کی رُوح —— یعنی موت کا خیال، پھونک دیا۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد معبود ہنسا اور رو دیا۔ اس نے لا انتہا اور غیر محدود محبّت کا احساس کیا اور اس احساس کے جذبے کے ماتحت اس نے اس انسان اور اُس نفس کو یکجا کر دیا۔

رحم کر، میرے نفس!

میرے نفس! میری کمزوری کو جانتے ہوئے آخر تُو کب تک رہیگا؟
تُو اچھی طرح جانتا ہے کہ میرے پاس تیرے خوابوں کی تعبیر کے لیے انسانی کلام کے سوا اور کوئی زبان نہیں تو پھر تُو کب تک چلائے گا؟

میرے نفس دیکھ! میں نے اپنی ساری زندگی تیری ہی تعلیمات کو سُنتے سُننے گذار دی۔

مجھے دُکھ دینے والے نفس غور کر! تیری وجہ سے آئی ہوئی مینتیں سہتے سہتے میں نے اپنا جسم ضائع کر دیا۔

میرا دل میری ملکیت تھی لیکن اب وُہ تیرا غلام ہے۔ میرا صبر میرا غمگسار تھا، اب وُہ تجھ سے مل کر مجھے طعنے دے رہا ہے۔ شباب میرا ساتھی تھا۔ اب وُہ مجھے ملامت کر رہا ہے اور مَیں جانتا ہُوں کہ سارے مصائب خُدا ہی کی طرف سے ہیں۔ اب تُو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہتا ہے۔ مجھ میں باقی کیا رہ گیا ہے جس کو چھین لینے کے درپے ہے۔

تُو نے میری ذات کا انکار کیا۔ تُو نے میری زندگی کی پناہ گاہ کو بے یار و مددگار چھوڑا۔ تُو نے میری عمر سے بے وفائی کی اور اب تیرے سوا میرا کوئی نہیں۔ خدا کے لئے اب میرے ساتھ انصاف کر۔ انصاف ہی میں تیری بزرگی ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر موت کو پکار اور اپنی حقیقت کو جسم کے اس قید خانے سے آزادی دے دے۔

اے نفس مجھ پر رحم کر! تُو نے محبت کا وُہ بھاری بوجھ میرے اُوپر ڈال دیا ہے جس کے اُٹھانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ تُو اور محبت ایک متحدہ قوت ہو لیکن مَیں اور مادہ متفرق کمزوری۔ کیا قوی اور کمزور کا یہ معرکہ اس طرح طول پکڑتا جائیگا؟

اے نفس مجھ پر رحم کر! تُو اور سعادت پہاڑ کی بلند چوٹی پر تھے۔ تُو

نے دُور سے مجھے سعادت کی جھلک دکھائی جب کہ میں اپنی بدبختی کے ساتھ وادی کی گہرائیوں میں کھڑا تھا۔ کیا بلندی اور پستی کی ملاقات ممکن ہے؟

اے نفس مجھ پر رحم کر! تو نے جمال کی جھلک دکھا کر اسے چھپا دیا۔ تُو اور جمال نُور میں ہو لیکن مَیں اور جہالت تاریکی میں۔ کیا نُور اور تاریکی آپس میں مل سکتے ہیں؟

اے نفس! تو آخرت کے آنے سے قبل اس کا نام سُن کر خوشیاں مناتا ہے۔ لیکن یہ جسم زندہ رہتے ہُوئے بھی اپنی زندگی کی وجہ سے بدبخت ہے، تُو بقا کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ لیکن یہ جسم فنا کی طرف بھی بہت آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا ہے۔ نہ تُو رُکتا ہے اور نہ یہ تیزی سے قدم اُٹھاتا ہے۔ اے نفس! یہ کتنی بدبختی ہے؟

تو آسمان کی کشش سے بُلندی کی طرف اُڑ رہا ہے۔ لیکن یہ جسم زمین کی کشش سے پستی کی طرف گرتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن نہ تو اس کی مدد کرتا ہے اور نہ یہ تجھے مبارکباد دیتا ہے۔ کیا یہ انتہائی افسوس کا مقام نہیں؟

اے نفس! تُو اپنی حکمت کی وجہ سے بے نیاز ہے۔ لیکن یہ جسم اپنے سلیقہ کی وجہ سے ہر ایک کا محتاج ہے۔ لیکن نہ تُو نسا ہل سے کام لیتا ہے

اور نہ ہی یہ تیری قبادت کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ کتنی نامُرادی ہے؟
تُو رات کے سکون انگیز لمحات میں محبوب کی طرف جاتا ہے۔ اس سے
مل کر اور گلے میں بانہیں ڈال کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن یہ جسم ہمیشہ
ق کا قتیل رہتا ہے۔
اے نفس رحم کر! خدا کیلئے رحم کر!

مُلاقات

جب رات نے آسمان کی چادر میں ستاروں کے موتی ٹکانے کا کام ختم کر لیا۔ اُس وقت نیل کی وادی سے دکھائی نہ دینے والے پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی ایک آسمانی حور بلندی کی طرف محوِ پرواز ہوئی اور بحیرۂ روم کے اُوپر چھائے ہُوئے اُن بادلوں کے تخت پر بیٹھ گئی جو چاند کی کرنوں سے سفید بن کر چمک رہے تھے۔ اس کے سامنے سے فضا میں اُڑتی ہوئی روحوں کی ایک جماعت گزری جو چیخ چیخ کر پکار رہی تھی! مصر کی ملکہ عیس کی شہرت ... کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی ہے۔ پاک ہے۔ پاک ہے۔ پاک ہے

تھوڑی دیر کے بعد دھان کی کھیتوں سے ایک نوجوان کا خیال اُوپر کو چڑھا اور محور کے قریب اُس تخت پر جا بیٹھا۔ روحوں کی جماعت واپس لوٹ آئی اور اس خیال کے سامنے گذرتے ہُوئے پکارنے لگی "لبنان کا جوان جس کی شہرت زمانے بھر میں پھیلی ہوئی ہے پاک ہے۔ پاک ہے۔ پاک ہے"

اور جب عاشق نے معشوقہ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں تو اس وقت فضا کی ہواؤں اور سمندر کی موجوں نے ان کی سرگوشیوں کو اقطارِ عالم تک پہنچا دیا:۔

"السیس کی بیٹی! تو کتنی حسین ہے اور میں کیا بتاؤں مجھے تجھ سے کتنی محبّت ہے"؟

"عزروت کے بیٹے! تو کتنا خوبصورت جوان ہے اور کیا کہوں میں تجھے کتنا پیار کرتی ہوں"؟

"محبوب! میری محبّت اہرامِ مصر کی مانند مضبوط ہے جسے کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی"۔

"میرے محبوب! میری محبّت دھان کے کھیتوں کی طرح ہے عناصر اسے ختم نہیں کر سکتے"۔

"محبوب! دنیا بھر کے فلسفی مشرق و مغرب سے تیری حکمت جاننے اور اسرار معلوم کرنے آتے ہیں"۔

"میرے محبوب! زمین کے بڑے بڑے جابر لوگ دُور دراز ملکوں سے اسی غرض سے آتے ہیں کہ تیرے جمال کے افسوں سے مست اور تیرے معانی کے جادو میں مدہوش ہو جائیں"۔

"محبوب! تیرے ہاتھوں کی ہتھیلیاں نیکیوں کے کھیت ہیں"۔

"میرے محبوب! تیرے بازو میٹھے پانی کے چشمے اور تیری سانسیں نسیم سحری کی مانند ہیں"۔

"محبوب! نیل کے محل اور اس کی عالیشان عمارتیں تیری بزرگی کی نشانیاں ہیں اور ابوالہول تیری عظمت کی کہانی زبانِ حال سے سُنا رہا ہے

"میرے محبوب! تیرے دھان کے کھیت تیری مستحکم شرافت کا پتہ دے رہے ہیں اور تیرے اردگرد مضبوط برج تیرے اقتدار اور تسلّط کی بقا کے شاہد ہیں"

محبوب! تیری محبت کتنی پیاری اور تیرے ساتھ ساتھ اُوپر کو اُٹھنے والی اُمیدیں کتنی لطیف ہیں"۔

میرے محبوب! تو کتنا شریف دوست اور کتنا وفادار ساتھی ہے

میرے تحفے اور تیرے عطیے کتنے حسین اور نفیس ہیں۔ تُو نے وُہ نوجوان بھیجے جو نیند کے بعد آنے والی بیداری کی طرح تھے۔ تُو نے کسی شہسوار کا تحفہ دیا تو اس نے میری قوم کی کمزوری کو دُور کیا۔ تُو نے کسی ادیب کا عطیہ بھیجا تو اس نے میری قوم کو بیدار کیا۔"

"محبوبہ! مَیں نے بیج کے دانے بھیجے تُو نے ان کو کلیوں کی شکل دے دی۔ مَیں نے چھوٹے چھوٹے پودے بھیجے تو تُو نے ان کو تناور درخت بنا دیا تو ایسا باغ ہے جو گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کی پرورش کرتا ہے اور گندم اور دھان کے پودوں کو بڑھاتا ہے۔"

"میرے محبوب! تیری آنکھوں میں غم کے آثار نظر آ رہے ہیں — کیا میرے قریب رہتے ہُوئے بھی تو غمگین رہتا ہے؟"

"محبوبہ! میرے فرزند سمندر پار گئے ہیں اور میرے لئے صرف رونا اور شوقِ ملاقات پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔"

"میرے محبوب! کاش مجھے بھی تیرے جیسا غم مل جاتا اور خوف ہر اس کا شاید میرے دل میں نہ رہتا۔"

"نیل کی بیٹی! تو ساری اقوام پر غالب ہے۔ کیا تُو بھی کسی سے خوف کھاتی ہے؟"

"میں ان شیاطین سے ڈرتی ہوں جو دوست بن کر میرے قریب آ رہے ہیں اور اپنی قوتِ بازو سے میری باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں"

"محبوبہ! قوموں کی زندگی بالکل افراد کی زندگی کے مشابہ ہے ایسی زندگی جس کے ساتھ اُمیدیں وابستہ ہیں۔ خوف اس سے ملا ہوا ہے، آرزوئیں اس کے گرد منڈلا رہی ہیں اور مایوسی گھور گھور کر اسے دیکھتی جاتی ہے"

اتنی دیر میں باتیں کرنے کے بعد دونوں گلے مل کر ایک دوسرے کے بوسے لینے لگے۔ رُوحوں کی جماعتیں پھر سامنے سے گزرتی ہوئی گیت گانے لگیں" محبت ہی پاک جذبہ ہے۔ پاک ہے۔ پاک ہے جس کی عظمت آسمان اور زمین پر پھیلی ہوئی ہے"۔

دوست کی واپسی

ابھی رات نہیں ہوئی تھی کہ دشمن شکست کھا گیا۔ اُس کی پشت پر تلوار اور نیزے کے زخموں کے نشان تھے۔ فتح پانے والا لشکر فخر کے جھنڈے لہراتا ہوا وادی کی پتھریلی زمین پر شور مچاتے ہوئے گھوڑوں کے سموں کی آواز کے ساتھ فتح و نصرت کے گیت گاتا ہوا واپس لوٹا۔

دُور اُفق سے چاند نکل رہا تھا اور یہ لشکر ایک ٹیلے پر چڑھا۔ وہ ٹیلہ ایسے دکھائی دینے لگا جیسے وہ قوم کی اُٹھتی ہوئی آوازوں کے ساتھ آسمان پر چڑھنے لگا ہو۔ ان ٹیلوں کے درمیان دھان کے کھیت اس طرح نظر آنے لگے گویا وہ لبنان کے سینے پر گذری ہوئی نسلوں کی ثبت کی ہوئی شرافت

کی مُہریں ہیں۔

چاند کی کرنیں لشکر کے چمکتے ہُوئے اسلحہ پر پڑ رہی تھیں۔ دُور دُور کے پہاڑ اس کے نعروں کا جواب دے رہے تھے اور وہ بڑھے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب وُہ پہاڑ کی چوٹیوں پر پہنچا تو رتیلی گھاٹیوں سے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز نے اس کو وہیں ٹھہرا لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گھوڑا اس کو خوش آمدید کہہ رہا ہے حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لئے لشکر گھوڑے کے قریب آیا۔ لشکر والوں نے دیکھا کہ مٹی اور خون میں لت پت ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔ فوج کا سپہ سالار چلایا "مجھے اس کی تلوار دکھاؤ تاکہ میں پہچان سکوں کہ یہ کون ہے" فوج کے بعض سوار گھوڑے سے اُترے اور لاش کے اردگرد کھڑے ہو کر اسے ٹٹولنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک سوار سردار کے پاس آ کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا! "اس کی ٹھنڈی انگلیاں تلوار کے دستے کے گرد جمی ہوئی ہیں۔ ان انگلیوں سے تلوار چھین لینا بہت مشکل ہے۔"

دُوسرے نے کہا۔ "اس کی تلوار کی آب خون کے نیام میں چھپی ہوئی ہے"

تیسرے نے کہا "ہتھیلی اور تلوار کے دستہ پر خون جم گیا ہے۔ کلائی

کے ساتھ مضبوط جما ہوا ہے اور دونوں ایک ہو گئے ہیں۔

سردار گھوڑے سے اُترا اور یہ کہتا ہوا مقتول کے قریب گیا! "اس کا سر اُٹھا لو تا کہ چاند کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ سکیں"۔ انہوں نے جلدی سے اس کا سر اُٹھایا۔ موت کے پردے کے پیچھے سے مقتول کا چہرہ ظاہر ہوا شجاعت اور بہادری کے آثار اب تک اس میں صاف نظر آ رہے تھے ـــ ایک ایسے شہسوار کا چہرہ جو زبانِ حال سے اپنی بہادری کی داستانیں سُنا رہا تھا مسرّت اور افسوس کے نشان ایک ہی ساتھ اس پر نظر آ رہے تھے ایسا چہرہ جو دشمن سے غضب کی حالت میں اور موت سے مسکراتا ہوا ملا' ایک لبنانی بہادر کا چہرہ جو آج کی لڑائی میں شریک رہا اور جس نے فتح کی علامات اپنی آنکھوں سے دیکھیں لیکن موت نے اسے اتنی بھی مہلت نہ دی کہ وُہ اپنے ساتھیوں سے مل کر فتح کی خوشیاں مناتا جب انہوں نے اس کا نقاب اُتارا اور اس کے زرد چہرے سے گرد وغبار دُور کیا تو سردار گھبراہٹ اور تکلیف سے چیختے ہُوئے بولا! آہ! یہ تو ابن الصعبی ہے"۔ لشکر کے تمام سپاہی بھی یہ سُن کر آہ و بکا کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد یہ سب خاموش ہو گئے اور سکوت طاری ہو گیا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فتح و ظفر کی شراب

کا خمار ان بدمست سپاہیوں کے سر سے اُتر گیا اور ان کو اب اس بات
کی ہوش آئی ہے کہ لڑائی میں حاصل کی ہوئی تمام کامیابی اس ایک
بہادر کی جان کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس حقیقت کو سمجھ
لینے کے بعد ان کی زبانوں پر مہر سکوت لگ گئی اور وہ پتھر کے بُت بنے کھڑے
کے کھڑے رہ گئے ——— بہادر اور شیر دل مردوں کے قلوب موت کا
یہی اثر لیتے ہیں۔ موت کا نظارہ دیکھ کر رونا اور پیٹنا عورتوں کا اور چیخنا چلانا
بچوں کا کام ہے۔ شمشیر بکف مجاہدوں کے چہروں پر موت کو دیکھ کر ہیبت ذدہ
اور ایسی خاموشی طاری ہو جایا کرتی ہے جیسے کوئی باز اپنے شکار کی گردن
دبوچ لے ——— ایسی خاموشی آنکھ کے آنسوؤں کو خشک اور زبان سے
نکلنے والی فریاد کو بند کر دیتی ہے اور اسی وجہ سے یہ مصیبت اور زیادہ ہولناک
اور دردناک صورت اختیار کر لیتی ہے ——— ایسی خاموشی فضا میں اُڑنے
والے نفوس کو پہاڑ کی چوٹیوں سے گہرے گڑھوں میں دھکیل دیا کرتی ہے
——— اور ایسی خاموشی اکثر آنے والے طوفانوں کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔
بہادر مقتول کے کپڑے اُتار کر دیکھنے لگے کہ کونسا مقام موت کا نشانہ
بنا ہے۔ نوکدار نیزوں کے زخم نوجوان کے سینہ پر یوں نظر آنے لگے گویا

وُہ رات کی پُرسکون خاموشی میں جوان ہمت نوجوان کی بہادری اور شجاعت کا پیغام دنیا کو دے رہے ہیں۔ لشکر کا سردار لاش کو غور سے دیکھنے کیلئے اور قریب آیا۔ اس کی نظر نوجوان کی کلائی سے بندھے ہوئے زرکشی رُومال پر پڑی۔ اس نے اسے غور سے دیکھا اور رُومال بنانے والے ہاتھ کو پہچان گیا وُہ جلدی سے رُمال کو اپنے کپڑوں اور اپنے غمگین چہرے کو لرزتے ہاتھوں سے چھپاتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹا ——— غمگین چہرے کو چھپانے والے ہاتھ وہی ہاتھ تھے جو اپنی ایک حرکت سے بڑے بڑے بہادروں کے سر اتار دیا کرتے تھے لیکن اب وُہ کمزور پڑ گئے تھے ان پر لرزہ طاری تھا اور وُہ آنسوؤں کو پونچھ رہے تھے۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیئے کہ ان ہاتھوں میں وُہ رومال تھا جو مقتول نوجوان کی کلائی پر ایک حسین اور نازک محبوبہ نے باندھا تھا۔ وُہ نوجوان جو یہ ارادہ لے کر آیا تھا کہ اپنی بہادری کے جوہر دکھا کر اپنی اور قوم کی عزت کی حفاظت کریگا اور جواب اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر سوار ہو کر محبوبہ کے سامنے جائیگا۔

سردار کے خیالات موت کے مظالم اور محبت کے اسرار کے سمندروں میں غوطے کھا رہے تھے کہ ایک نے کہا: "آؤ! بلوط کے اس درخت کے

نیچے اس کی قبر کھود دیں۔ اس کی جڑیں اس کے خون سے سیراب ہونگی اور
اسکا جسم اس کی شاخوں کی غذا بنے گا۔ اس طرح درخت کی جڑیں مضبوط
اور اس کی عمر پائیدار بن جائیگی۔ یہ درخت ہمیشہ کیلئے ان ٹیلوں کے سامنے
نوجوان کی بہادری اور شجاعت کی یادگار رہیگا۔"

دُوسرے نے کہا: "اس کو چاولوں کے کھیتوں میں گرجے کے قریب دفن
کرنا چاہیئے تاکہ اس کی ہڈیوں پر ہمیشہ کے لئے پاک صلیب کا مُبارک سایہ پڑتا
رہے۔"

تیسرے نے کہا: "اس کو اسی مقام پر دفن کرنا چاہیئے جہاں کی مٹی
اس کے خون سے سیراب ہو چکی ہے۔ اس کی تلوار اس کے دائیں طرف
رکھ دینی چاہیئے اس کا نیزہ اس کے بائیں طرف گاڑھ کر اس کے گھوڑے
کو اس کی قبر پر ہی ذبح کر دینا چاہیئے تاکہ اس کی تنہائی میں اس کا اسلحہ
اس کا دائمی مونس و غمگسار رہے۔"

چوتھے نے کہا: "دشمن کے خون سے رنگین تلوار کو مٹی میں دفن نہ کرو
موت کے میدان میں آگے بڑھتے ہوئے گھوڑے کو ذبح نہ کرو اور ان
ہتھیاروں کو خالی میدان کے سپرد نہ کرو جو مضبوط کلائیوں اور طاقتور ہاتھوں

میں رہنے کے عادی ہیں بلکہ ان تمام اشیاء کو نوجوان کے صحیح وارثوں تک پہنچا دو۔ اس لیئے کہ وہی اس کے سچّے حقدار ہیں"۔

پانچویں نے کہا۔ "آؤ! ہم سب مل کر اپنے مذہب کے مطابق اس کی لاش پر نماز پڑھیں اور اس کے لیئے دعا مانگیں تاکہ اس کی بخشش ہو اور ہماری فتح اس بہادر کی وجہ سے مبارک رہے"۔

چھٹے نے کہا! "آؤ نیزوں اور ڈھالوں کا تابوت بنا کر اس کو اپنے کندھوں پر اُٹھائیں۔ فتح و ظفر کے گیت گاتے ہُوئے ان وادیوں کے چکر کاٹیں تاکہ نوجوان اپنے ضمیر کی آنکھوں سے دشمن کی لاشوں کو دیکھے اور مٹی میں مل جانے سے قبل اس کے زخم دشمنوں کو دیکھ دیکھ کر ہنسیں"۔

ساتویں نے کہا! "نہیں۔ آؤ۔ اس کو اپنے گھوڑے کی زین پر بٹھا کر دشمنوں کی کھوپڑیوں کا سہارا اس کے لئے تلاش کریں۔ اس کے نیزے کو اس کے گلے میں لٹکائیں اور کامیاب مجاہد کی طرح اسے شہر میں لے جائیں اس لئے کہ اس نے اس وقت تک جان نہیں دی جب تک دشمنوں کی روحوں کا بھاری بوجھ اس کے کندھوں پر نہ پڑا"۔

آٹھویں نے کہا! "آؤ! اس پہاڑ کے دامن میں اس کے جسم کو سپردِ خاک

کر دیں۔ آبشاروں کی صدائیں اس کا ساتھ دینگی۔ ندیوں کی آوازیں اس کی غمگسار بنیں گی اور اس طرح ایسے جنگل میں جہاں رات بھی دبے پاؤں آیا کرتی ہے اس کی ہڈیاں ہمیشہ مسرت محسوس کرینگی۔"

نوویں نے کہا "اس کو یہاں نہ چھوڑو۔ اس جنگل میں وحشت برستی ہے اور مہیب تنہائی اس جگہ طاری رہتی ہے بلکہ چلو اس کو شہر کے قبرستان میں لے جائیں۔ ہمارے آباواجداد کی روحیں اس کے ساتھ رہیں گی۔ رات کی خاموشی میں یہ آپس میں سرگوشیاں کرینگی اور اپنی لڑائیوں اور اپنے کارناموں کے قصے اس کو سنائیں گی"۔

یہ تمام تجویزیں سننے کے بعد سردار لشکر کے درمیان آیا۔ سب کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کیا اور پھر ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا! لڑائیوں کی یاد دلاکر اس کے سکون میں خلل نہ ڈالو۔ اس کی روح کے کانوں تک جو ہمارے سروں پر اڑ رہی ہے تلواروں اور نیزوں کی خبریں نہ پہنچاؤ بلکہ آؤ اس کو آرام سے اٹھاکر اس کے گھر پہنچائیں۔ اس لئے کہ اس قبیلہ میں ایک ایسی روح ہے جو اس کے استقبال کے لئے ہمیشہ سے جاگ رہی ہے ـــــ ایک نوجوان دوشیزہ کی روح جو نیزوں سے گھرے ہوئے میدان

سے اس کی واپسی کی منتظر ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اس کی لاش کو اُس تک پہنچا دیں
تاکہ وہ اس کے چہرے پر آخری نظر ڈالنے اور اس کی پیشانی کا آخری بوسہ
لینے سے محروم نہ رہے۔

نوجوان کی لاش کو کندھوں پر اُٹھایا گیا۔ سب کے سر جھکے ہوئے اور
آنکھیں اشک آلود تھیں۔ غم انگیز خاموشی کے ساتھ وہ جا رہے تھے اور
نوجوان کا گھوڑا غمگین صورت بنائے اپنی لگام کو پیچھے گھسیٹتا ان کے پیچھے پیچھے
آرہا تھا۔ وہ کبھی کبھی ہنہنانے لگتا۔ ٹیلے اس آواز کا جواب صدائے بازگشت
کی شکل میں دیتے۔ گویا کہ وہ ٹیلے بھی ایسے دلوں کے مالک ہیں جو اس وفا شعار
جانور کے درد و کرب کا احساس رکھتے ہیں۔

اس وادی کے درمیان جہاں چاند کی چاندی چھڑی قدم
رکھتی ہے، فتح و ظفر کا قافلہ موت کے قافلے کے پیچھے پیچھے اور دونوں قافلوں
کے آگے آگے خیالی محبت اپنے ٹوٹے ہوئے پروں کو گھسیٹتے ہوئے جا رہے
تھے۔

سُورج ___ تلہ

اے عالم ارواح کی فضا میں گھومنے والی رُوح! اے رُوح کہ تُو نے اس مادی لباس کو پھینک دیا ہے جو ہم اس وقت پہن رہے ہیں۔ تُو نے ضعف و مایوسی سے پیدا شدہ کلام کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا اسی کلام کو جس نے جسم کے قیدی انسانوں کے قلب میں کمزوری اور مایوسی کا احساس پیدا کر دیا تھا۔

تو اس وقت جانتی ہے کہ اس زندگی میں ایسے معانی پوشیدہ ہیں جن کو موت نہیں چھپا سکتی لیکن انسان ان حقائق کو نہیں جان سکتا کیونکہ

صرف اس وقت پہچانی جاتی ہیں جب نفس جسم کی قیود سے آزاد ہو جائے
تو اس وقت جانتی ہے کہ زندگی ہوا کی طرح ناپائیدار نہیں ہے اور
تُو یہ بھی جانتی ہے کہ اس سورج کے نیچے کوئی چیز بھی بیکار نہیں بلکہ ہر چیز
ہمیشہ سے حقیقت کی طرف بڑھتی چلی آئی ہے اور بڑھتی چلی جائیگی لیکن
ہم بے چاروں نے تیرے کلام کا سہارا لیا۔ تیری باتوں کو سوچتے رہے اور
انہیں کو حکمت کا مجموعہ سمجھا حالانکہ ــــــ تو جانتی ہے ــــــ وہ ایسی
ظلمت ہے جو عقل کو بیکار بنا دیتی ہے اور اُمید کی کرنوں کو چھپا دیتی ہے۔

تُو اب جانتی ہے کہ حماقت، شرارت اور ظلم کے اسباب جمالیاتی بھی
ہوئے ہیں لیکن ہم جمال کو صرف ظاہری حکمت، بہتر انجام اور عدل کے پھل
ہی سے پرکھنے کے عادی ہیں۔

تُو جانتی ہے کہ غم اور غریبی انسانی دل کو صاف کر دیا کرتے ہیں لیکن
ہماری ناسمجھ عقل صرف خوشی اور دولتمندی ہی کو زندگی کا سہارا سمجھتی ہے۔

تُو اب جانتی ہے کہ نفس زندگی کے مصائب سے تنگ آکر ابدی نور
کی طرف بڑھتا جاتا ہے لیکن ہمارے ذہن میں ہر وقت تیری یہی بات چکر
کاٹتی رہی کہ "انسان کسی غیر معروف قوت کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے۔"

تُو ایسی رُوح کو باقی رکھنے سے نادم ہو رہی ہے جو حیاتِ حاضرہ کی محبّت کو ترقی دے رہی ہے اور آنے والی دائمی زندگی کو ختم کر دینے پر تُلی ہوئی ہے۔ لیکن ہم اب تک تیرے اقوال ہی کو یاد رکھتے ہیں۔

اے غیر فانی دُنیا میں بسنے والی رُوح! حکمت کے عاشقوں کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ وُہ نا اُمیدی اور انکار کے راستوں کو چھوڑ دیں یہی تیری غیر ارادی غلطی کا کفّارہ ہو سکتا ہے۔

درخت کی کہانی اسکی اپنی زبانی

میری کہانی بہت طویل ہے۔ میری ابتداء اُس وقت ہوئی جب
میں گٹھلی کی شکل میں زمین کے نیچے دبا ہوا تھا اور گٹھلی کا مغز چھلکے کو پھاڑ
کر سر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں خود اپنے وجود کو باہر نکال کر روشنی
دیکھنے کی تمنّا میں تھا۔

اس صبح کی یاد میں، مجھے اب تک لُطف آتا ہے، جب مَیں نے پہلی
بار اپنے آپ کو زمین کے ایک شگاف سے سر نکالتے ہوئے اور ان
جنگلوں اور کھیتوں کی ہوا کھاتے ہوئے دیکھا۔ کتنی خوشگوار گھڑی تھی۔

کہ بیشمار بہاریں گذرنے کے بعد بھی اس کی یاد میرے دل میں باقی ہے باوجود اس کے کہ اس وقت میں زمین سے پیوست تھا۔ میری کمزور شاخیں دور سے ایک ہی شاخ کی شکل میں نظر آرہی تھیں۔ اس وقت بھی میرے دل میں ایک اُمنگ تھی جو ہر درخت میں فطری طور پر پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کو بیان کرنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ چاہے ہماری شاخیں اور پتّے ہونٹوں اور زبانوں میں تبدیل کیوں نہ ہو جائیں —— اپنے دل میں بسنے والی بات کے بیان کرنے سے بھی ہم عاجز ہیں —— ہماری سرسبز زندگی میں، نہیں بلکہ ہر اُس چیز کی زندگی میں جو زمین سے نمودار ہوتی ہے یا زمین کی سطح پر چلتی پھرتی ہے، وہ اسرار پوشیدہ ہیں جو ظاہری علامات سے پہچانے نہیں جا سکتے۔

میری عمر کی پہلی بہار گذر چکی۔ گرمی آئی وہ بھی گذر گئی۔ پھر خزاں آئی۔ اب میری قامت بڑھ چکی تھی۔ میرا سر اُوپر کو اُٹھ گیا تھا اور مَیں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ دُور دُور جنگل کا وسیع میدان اور کہیں کہیں اس کے موڑ نظر آنے لگے۔ مَیں نے صبح کے وقت شاخوں

کے سایوں کو دیکھ کر سوچنا شروع کر دیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ
ان سایوں کی شکلیں بھی بدلتی تھیں، شام ہونے کے ساتھ ساتھ وہ
شکلیں مٹ جاتیں اور ان کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ ان سایوں میں
ایک جادو بھرا راز ہے جو ہمیں جستجو کی دعوت اور ترغیب دیتا ہے۔ میں نے
اپنے دل سے کئی بار پوچھا کہ درختوں کے اسرار تو ان کے سایوں کی حقیقت
سے بھی زیادہ غامض ہونگے۔۔۔۔۔ کئی بار تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اس
جنگل میں جو کچھ دیکھتا ہوں اور جو آواز بھی میرے کانوں میں پڑتی ہے وہ
کسی ایسی چیز کا سایہ ہے جسے ہم دیکھتے نہیں — وہ کسی ایسی
مخلوق کی صدائے بازگشت ہے جو آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔

ان گذشتہ تین موسموں میں میں نے اپنی زندگی کا جائزہ لیا۔ مجھے
یہ زندگی ایک مسلسل خوشگوار عبادت کی طرح معلوم ہوتی جو میری کمزور
شاخوں کے لرزنے سے لرز رہی ہو۔ میرے باریک پتوں کی مہک کو
ساتھ لے کر آسمان کی طرف چڑھتی ہے لیکن اس زمانہ میں سب سے
بہترین راز جو مجھے معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ میری نازک شاخیں اس چڑیا
کے بوجھ سے بھی جھک جاتی تھیں جو کسی اونچے درخت سے کود کر

ان پر آ بیٹھتی تھی ..... مَیں نے جب بھی اس چڑیا کا تصوّر کیا تو اپنے اندر خوشگوار احساسات کا لطیف جذبہ محسوس کیا ہے۔ اس لئے کہ وہی سب سے پہلا پرندہ تھا جس نے مجھے قابلِ توجہ سمجھا اور مجھے اپنی ملاقات کا شرف بخشا۔ اور عجیب بات تو یہ ہے کہ مَیں نے جب بھی اس پرندے کو یاد کیا اپنے اندر جھک جانے کا احساس پایا۔ حالانکہ میری عمر اب اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ میرا تنا مضبوط اور میری شاخیں سخت ہو چکی ہیں اور مضبوط چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی ہوائیں مجھ سے ٹکراتی ہوئی گذر جاتی ہیں۔

خزاں کا وُہ موسم بھی گذر چکا۔ سردی کا موسم آیا۔ جاڑے کی سرد ہواؤں نے میرے زرد پتّے جھاڑ دیئے اور پھر میرے ساتھ کھیلنے لگیں کبھی وُہ مجھے گھاس کی طرف جھکا دیتیں جیسے کہ وُہ مجھ سے کوئی انتقام لے رہی ہوں اور کبھی میرے دل کے تاروں کو چھیڑ کر اور بیتے ہوئے دن یاد دلا کر مجھے ناچنے پر مجبور کرتیں اور اس طرح خوش آئند واقعات کی اُمیّد دلاتیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد برفباری شروع ہوئی اور مَیں چنبیلی کے پھُول کی طرح سفید لباس میں ملبوس نظر آیا۔ سردی سے مَیں

کانپ تو اٹھا لیکن اس کے باوجود اس لباس سے مجھے کچھ اُنس سا ہوگیا خصوصاً اس وقت تو میں پھولے نہ سماتا اور فخر و غرور سے بار بار اپنے آپ کو دیکھتا رہتا پھر جب بادل چھٹ جاتے اور سورج کی شعاعوں سے میرا یہ برفانی لباس اور زیادہ چمکنے لگتا۔

سردی کے وہ ایام بھی گذر چکے۔ میں تیز و تند آندھیوں اور لگاتار برفباری کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہ پورا زمانہ ایسے گذر گیا جیسے کوئی شخص ایک طویل عرصے سے سو رہا ہو اور کبھی کبھی اس کی آنکھ کھلتی رہے۔

نہ تو خوفناک سردی مجھ میں کمزوری کے آثار پیدا کر سکی اور نہ اسکی سختی میری دلی اُمنگوں کو دبا سکی۔ جب بھی تیز ہوائیں چلنی شروع ہوتیں میں اپنی جڑوں کو اور سختی سے زمین کے اندر پیوست کر دیتا اور مٹی کے نیچے دبی ہوئی کنکریوں پر اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑ لیتا۔

بہت دفعہ مجھے خیال آیا کہ یہ تیز و تند ہوائیں بھی شفیق اُستاد بن کر کمزور اور نوعمر درختوں کو سکھانے پڑھانے آتی ہیں کہ زمین پر مضبوطی سے پنجے گاڑھنے کا طریقہ کیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک غضبناک دشمن کے بھیس میں ظاہر کرتی ہیں جو اپنے حملوں سے ان کو بیخ و بُن سے اکھاڑ

پھینکنے کی کوشش کر رہا ہو۔

مَیں آندھیوں کا بھی ممنون ہوں۔ اگر یہ آندھیاں نہ ہوتیں تو مجھے ہرگز اس بات کا پتہ نہ چلتا کہ جن کی جڑیں کھوکھلی ہوتی ہیں ان کی شاخیں کبھی سربلند نہیں ہو سکتیں اور جو تاریکیوں میں گھس جانے سے گریز کرتا ہے وُہ کبھی نُور کو پا نہیں سکتا۔

بہار کا دوسرا موسم آیا تو میری رگ رگ میں زندگی کا خون دوڑنے لگا۔ میری شاخوں نے سبز چھوٹے پتوں کا لباس پہن لیا۔ مَیں نے سوچا کہ بس اب میں انتہائی عروج تک پہنچ گیا۔ اُس وقت میرے ذہن میں اس کا خیال تک نہیں تھا کہ ہر سعادت کے بعد ایک اور سعادت آتی ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور ہر کمال کے بعد ایک اور بامِ عروج ہوا کرتا ہے۔

بہار کے تیسرے موسم میں پہلی کلی میرے جسم کے ایک حصّے پر نمودار ہوئی۔ مَیں نے محسوس کیا کہ میرا جسم اچانک ایسے پھولوں میں تبدیل ہو گیا ہے جو آسمان اور زمین کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ ہوا کے کانوں میں ایسے مہکنے والے کلمات پھونکتے ہیں جن میں وہ محبت بھرے دلوں کی سرگوشی، عابدوں کی

زاری اور شاعروں کا تخیّل رقص کرتے ہیں۔

تھوڑے دنوں میں نسیمِ سحری کے جھونکوں سے میرے جسم پر کھلتے ہوئے پھولوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ میری شاخیں پھولوں سے لدنے لگیں اور میں ہر پھول کے کھل جانے پر یہ سمجھتا کہ میری رُوح کا ایک جُز مجھ سے چھین لیا گیا۔ اس احساس کی وجہ سے میں قدرت کی ان شوخیوں سے دل برداشتہ ہو گیا۔ میں دل میں کہتا کہ آخر یہ کونسا طریقہ ہے کہ قدرت اپنے ہی ہاتھوں ہمیں ایک حسین لباس پہناتی ہے اور پھر جلد ہی اُسے اُتروا بھی لیتی ہے۔

ان دردناک احساسات کے ساتھ تھوڑے ہی دن گُذرے تھے میں نے دیکھا کہ ہر جھڑے ہوئے پھول کی جگہ میرے جسم پر ایک نازک، خوش وضع اور خوش رنگ پھل ظاہر ہو گا۔ یہ دیکھ کر خوشی کی وجہ سے میری حالت اُس انسان جیسی ہو گئی جو ڈراؤنا اور خوفناک خواب دیکھتے دیکھتے گھبرا کر اُٹھتا ہے تو صبح کی ٹھنڈی ہوا اس کے استقبال کے لئے موجود ہوتی ہے۔ مجھے یقین آیا کہ نقصان کے بغیر، نفع اور سخاوت کے بغیر بخشش کی اُمید بے سُود ہے۔

ایک ہفتہ کے اندر اندر اس نازک پھل کے مغز کے ارد گرد سخت چھلکے کا غلاف چڑھ گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اب "ماں" بن گیا ہوں۔ ہزاروں بچوں کی ماں، اور میں نے دیکھا کہ قدرت کے مخفی ہاتھوں نے اس ایک گٹھلی کو ہزاروں گٹھلیوں میں بدل دیا ہے جیسے انہیں ہاتھوں نے آج سے تین برس پہلے مٹی کے نیچے دبایا تھا اور ان میں سے ہر گٹھلی اس کی اہل ہے کہ وہ کسی نہ کسی دن اُونچے تناور درخت کی شکل اختیار کرے اور اسی طرح یہ موت و حیات کا سلسلہ چلتا رہے۔ یہ کیسی معرفت ہے جس نے مستقبل کے حالات میرے سامنے رکھے اور مجھے یقین دلایا کہ میرے پھل ہمیشہ باقی رہیں گے۔ یہ کیسی نشوونما ہے جس نے مجھے زندگی کے اسرار اور اس کے کھلے ہوئے حقائق کے سامنے لا کھڑا کیا۔

مہینوں پر موسم اور سالوں پر سال گذرتے گئے اور میں اسی طرح پھلتا، پھولتا اور اُوپر کو اُونچا ہوتا گیا۔ میرا چھلکا سخت ہو گیا۔ میری ٹہنیاں ہر طرف پھوٹنے لگیں اور میری شاخیں ایک دوسرے سے اُلجھنے لگیں۔ میں ایک ایسے سرسبز اور مضبوط درخت کی شکل میں تبدیل ہو گیا جو اپنے مناقب پر فخر کرتا ہو اور اپنے محاسن کو سراہتا ہو۔ لڑکے میرے اُوپر

چڑھ کر کھیلنے لگے۔ پرندوں نے میرے پتوں کے اندر اپنے گھونسلے بنائے۔ جانور میرے سائے میں سستانے لگے اور سورج کے نیچے ایسی کوئی چیز باقی نہ رہی جن کو میں نے آزمایا نہ ہو۔ میں نے ایسی بے شمار راتیں کھڑے کھڑے گذار دیں جن میں نسیم کے ٹھنڈے جھونکے چلتے رہے۔ میں ٹیلوں اور گھاٹیوں کو تاکتا رہا۔ ندیوں کی ترنّم زا آوازوں کو کان لگا کر سنتا رہا۔ میں نے ستاروں پر نظریں جمائیں اور تاریکی کے سایوں کی حرکتیں محسوس کرتا رہا۔

بہت سے پرندے میرے پتّوں میں چھپ کر دردناک آواز سے پکارتے رہے۔ ان کی دردناک آوازیں میرے دل میں ایک نامعلوم خلش پیدا کرنے کا سبب بنیں اور میں چاہتا کہ کاش ایسی تیز آندھی چلے جو مجھے جڑ سے اُکھاڑ کر دُور کسی اور جنگل میں ڈال دے۔

بہت سے کیڑوں نے میری جڑوں کو کھوکھلا کیا، پرندوں نے میرے پھل توڑے۔ نہ مجھے دن کی روشنی میں آرام ملتا اور نہ رات کی تاریکی میں، اور میری حالت ایسی عورت کی طرح تھی جو کسی مرد سے محبّت کرے اور وہ اس سے دُور رہے اور اس کی جگہ ایسا مرد اس کے سر پہ

مسلط ہو جس سے وہ نفرت کرتی ہو۔

ہاں۔ مَیں نے زندگی کی مسرّت اور اس کے مصائب دونوں کو آزمایا ہے۔ مَیں نے اس کی محبّت اور نفرت دونوں کا تجربہ کیا ہے میری حالت چار موسموں میں اس ترازو کی تھی جس کے پلڑے باری باری اُوپر کو اُٹھتے اور زمین کو چھُوتے ہیں۔

مَیں نے اپنی زندگی کے ان سات سالوں میں جو مَیں نے سورج کے سامنے کھڑے ہو کر گذارے انسان کے ایسے ایسے مصائب و مظالم کا مشاہدہ کیا۔ جن کی یاد کو میرے دل سے نہ تو بہار کی خوش آفرینی مٹا سکتی ہے اور نہ سردی کی مدہوشی اس کو فراموش کرا سکتی ہے۔ دو ایسے حادثے بھی مجھ پر گذرے کہ جب مَیں ان کو یاد کرتا ہوں تو میری رُوح کانپ اُٹھتی ہے اور مجھے اپنے گرد مظلوم روحوں کی ایک بھیڑ نظر آتی ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دن تپتی ہوئی گرمی کے موسم میں جب پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کو واپس لوٹ چکے تھے اور کلیوں کی پتّیاں ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سامنے ٹیلے کے پیچھے سے

ایک نوجوان میری طرف آیا۔ میرے تنے سے سہارا لے کر غمگین آنکھوں سے راستہ کی طرف دیکھنے لگا۔ نوجوان کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ تھوڑی دیر میں ایک نوجوان دوشیزہ غم و اندوہ کا نقاب منہ پر ڈالے نمودار ہوئی۔ وہ نوجوان کے قریب آئی۔ اس کے سینے پر اپنا سر رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نوجوان نے اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا! "جنابِ من! دل کو ڈھارس دو جدائی کی گھڑیاں زیادہ لمبی نہیں ہونگی۔ میں سال دو سال کے اندر اندر واپس آکر تم سے ملونگا اور اس وقت دونوں مل کر اپنی آئندہ زندگی خوشی سے گذار دینگے"۔ دوشیزہ نے جواب دیا۔ کون جانے! جہاں تم جا رہے ہو وہاں کسی اور سے مل کر میری یاد اپنے دل سے نکال دو۔ ادھر میں اس وقت تک اپنے وعدے پر قائم ہوں جب تک تمہاری ماں مجھے شبِ عروسی کے کپڑے یا اپنی ماں مجھے کفن نہ پہنا دے"۔ اتنا کہتے ہی اس کی آواز بھرا گئی اور وہ رک رک کر کہنے لگی۔ سمندر ہم سے جو چیز چھین لیتے ہیں وہ کبھی واپس نہیں دیتے۔ خدا ان سمندروں کا ستیاناس کرے اور ساتھ ہی ان لوگوں کا جنہوں نے سمندروں میں

سفر کا دستور پہلے پہل شروع کیا۔ اتنا کہہ کر وُہ زار و قطار رونے لگی
نوجوان نے اسے گلے لگایا۔ اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر آنکھوں
کو بوسہ دیتے ہوئے ایمان کی قسم کھا کر کہنے لگا کہ سال ختم ہونے سے
پہلے پہلے وُہ اس سے آکر ملے گا پھر وُہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدٰہ
ہوئے اور میرے گرد اپنے درد و غم کا کہر چھوڑ کر چلے گئے۔

دوسرے دن شام کے وقت دوشیزہ تنہا آکر وہیں بیٹھ گئی جہاں
پچھلی رات وُہ اپنے محبوب کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے
ڈوبتے ہُوئے سُورج کی طرف دیکھنا شروع کیا معلوم ہوتا تھا کہ وُہ افق
کے سیاہ خط اور سُنہرے بادلوں کے درمیان ایسی ابدی حقیقت کی جستجو
کر رہی ہے جو روشنی اور اندھیرے، زندگی اور موت کی شکل میں نمودار ہو
پھر اُس نے زمین پر نظر ڈالی اور قریب ہی اسے اپنے محبوب کا نقش
قدم نظر آیا۔ وُہ لرزتی ہوئی انگلیوں سے قدم کے نشانات کو چھونے لگی
پھر زار و قطار رونے لگی۔

اسی طرح وُہ دوشیزہ میرے پاس آتی رہی اور میرے سائے میں
بیٹھتی رہی۔ کبھی کبھی وُہ دردناک اور دھیمی آواز سے غم کے گیت گاتی اور اس

کی آواز کے ساتھ ساتھ جنگل کی تمام مسرتیں غم و اندوہ میں بدل جاتیں۔

اپنی عادت کے مطابق وہ اس دن بھی آئی جب ان کی جدائی کے پورے دو برس گذر چکے تھے۔ اس کے ہاتھ میں مہر شدہ خط تھا جس کو وہ بار بار چومتی تھی۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور ابھی اس خط کی چند سطریں ہی پڑھ سکی تھی کہ وہ تڑپتی ہوئی زمین پر گر پڑی اس کی انگلیاں زمین میں دھنسنے لگیں اور پھر وہ یکبارگی سیدھی اٹھ کھڑی ہوئی اور زلفیں بکھیر کے اونچی آواز سے ہنستی ہوئی درختوں سے کھیلنے لگی۔

نہیں میں نے اپنی زندگی میں ایسی ہنسی کبھی نہیں سنی تھی آندھیوں کا شور میں نے سنا تھا بجلی کی کڑک کی آوازیں میرے کانوں میں پڑی تھیں۔ جھیل کے درندوں کی چنگھاڑیں میرے کانوں تک پہنچی تھیں لیکن کسی دوشیزہ کی عجیب اور ہیبت ناک ہنسی کی آواز کبھی میرے کان میں نہیں آئی میں نے ایسی آواز کبھی نہیں سنی جس میں خوف، غم، مایوسی اور جنون کے جذبات بیک وقت موجود ہوں۔ اس دوشیزہ کی ہنسی سے پہلے میرے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ موت کی خوفناک آواز ہنسی کی صورت میں بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔

یہ پہلا عظیم حادثہ تھا۔

دوسرا حادثہ اس سے بھی دردناک ہے۔ اس کی یاد، جب بھی
میرے دل میں آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میری جڑوں، شاخوں
اور ٹہنیوں کو تیز درانتی سے کاٹنے لگا ہے، اور اب جبکہ میں اس واقعہ کا
ذکر کرنے لگا ہوں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے
ہو کر میری آواز کے ساتھ ساتھ ریزہ ریزہ ہو رہا ہے لیکن الفاظ سکے
ساتھ ساتھ باہر نہیں نکلتے۔

سات سال ہوئے فوج کی ایک جماعت، زنجیروں میں جکڑے
ہوئے ایک نوجوان کو ان ٹیلوں پر لائی۔ نوجوان کی شکل وشباہت
اور اس کے اوضاع واطوار اس کی شرافت اور شجاعت کا پتہ دے
رہے تھے۔ جب وہ جماعت اس ٹیلے کے قریب پہنچی تو فوج کے سردار
نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ درخت بہت موزوں ہے"۔
وہ سب میرے قریب آئے۔ ایک آدمی اس نوجوان کو لے کر آگے بڑھا
اور اس کی گردن میں رسّی کا پھندا ڈالا۔ پھر انہوں نے میری ایک شاخ پر
رسّی لٹکائی اور چند آدمیوں نے مل کر رسّی کھینچنی شروع کی۔ نوجوان بین

سے دو گز اُوپر کو اٹھا۔ پھر انہوں نے رسّی کے دوسرے سرے کو میرے
تنے سے مضبوط باندھ دیا اور تڑپتے ہوئے جسم کا تماشہ دیکھتے رہے
حتّیٰ کہ وہ سرد ہو کر ساکن ہو گیا تو پھر وُہ سب واپس چلے گئے۔

مَیں نے کئی بار تیز ہواؤں سے التجا کی کہ وہ آسمان پر کڑکتی
ہوئی بجلی کی تلوار بنا کر میری اس شاخ کو تنے سے الگ کر دیں جس کو
ان باغی ظالموں نے اپنے ظلم میں شریک کیا۔ کتنی بار مَیں نے آرزو کی
کہ کاش اس شاخ کو کیڑے کھا جائیں اور یہ زمین پر بچھی ہوئی گھاس کے
اُوپر سرنگوں ہو جائے اور خزاں کے پتّوں کی طرح اس کا نام و نشان
دنیا میں نہ رہے۔

لیکن میری تمام آرزوئیں ناکام رہیں۔ اس شاخ سے اسی طرح
کلیاں پھوٹتی ہیں پھل لگتے ہیں اور یہ سورج کی روشنی سے لطف اندوز
ہوتی ہے نسیم کے جھونکوں سے مست ہو جاتی ہے اور بارش کے پانی
سے نہا کر خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔ یہ شاخ غم کی اس کہانی کو بالکل
بھول گئی ہے اس شاخ کو دیکھ کر مَیں اس نتیجے پر پہنچا کہ فطرت میری خواہشات
کی پروا نہیں کرتی۔ میرا وجود میرے احساسات سے بے نیاز ہے اور

قدرت کے ارادے پر موقوف ہے۔ وہ ایک ایسے قانون کا پابند ہے جو کسی کا پابند نہیں۔

ماضی میں اور بھی بہت سے واقعات پوشیدہ ہیں ان کی تعداد شبنم کے ان قطروں سے بھی زیادہ ہے جو صبح کے وقت میرے پتوں پر پڑتے ہیں۔ اور وہ واقعات سورج کی شعاعوں اور عناصر کے تغیّرات سے بھی زیادہ تعجب خیز ہیں۔ اگر میں ان تمام واقعات کو دہرانے لگوں تو میرے لئے لازم ہوگا کہ اپنے گذرے ہوئے زمانے کی طرف دوبارہ لوٹوں حالانکہ مجھے اس پر قدرت نہیں۔

لیکن زندگی کے تمام مسرت انگیز لمحوں اور اندوہناک گھڑیوں مختلف موسموں کی عنایات اور ان کے لائے ہوئے مصائب سے مجھے جو تجربات حاصل ہوئے ان سب سے محبوب اس چڑیا کی یاد ہے جو پہلی مرتبہ میری شاخ پر آکر بیٹھی جب میں بالکل نازک تھا۔ اس کے ننھے منّے جسم کا بوجھ میں برداشت نہ کر سکا۔ اور اس کی وجہ سے مجھ میں اتنی خودداری پیدا ہوئی کہ میں بھی درختوں کی صف میں شمار ہونے لگا۔ اس گھڑی کی یاد میں ایسے گیت پوشیدہ ہیں جن کو میں غروب آفتاب کے وقت سنتا ہوں۔ اس

وقت کی یاد میں ایسے شعلے چھپے ہوئے ہیں جو پُرسکوں رات کی خاموشی میں مجھے نظر آتے ہیں۔ اس لمحہ کی یاد میں محبت، غم اور سوز ہے اور اسی میں صبر و قناعت۔

مستقبل پر ایک نظر

حاضر کے پردوں کے پیچھے سے میں نے انسانیت کی تسبیحیں سُنیں۔

ایسی گھنٹیوں کی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں جو جہالت کی عبادتگاہ میں، عبادت کے وقت کا اعلان کرتی ہوئی، فضا کے ذرّے ذرّے کو بیدار کر رہی تھیں — اور جو قوّت و اختیار کے مقدس مندر پر لگائی گئی تھیں — انسان کا دل۔

مستقبل کے پردوں کے پیچھے مجھے ایسی جماعتیں نظر آئیں جو

مشرق کی طرف مُنہ کئے فطرت کے مصلّے پر سجدہ میں پڑی تھیں اور صبح کی روشنی کی منتظر تھیں —— حقیقت کی صبح۔

مَیں نے اُجڑے ہوئے شہر پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس کے آدھے مٹے ہوئے آثار یہ بتا رہے تھے کہ تاریکی کی جگہ نُور نے لے لی ہے۔

مَیں نے بوڑھوں کو دیکھا کہ وہ اخروٹ کے درختوں کے سائے میں بیٹھے ہیں اور بچے ان کے اردگرد بیٹھے ہوئے ماضی کی باتیں سُن رہے ہیں۔

مَیں نے نوجوان لڑکوں کو دیکھا جو چنبیلی کی بیل کے نیچے بیٹھے نَے دسرود سے کھیل رہے ہیں اور نوجوان لڑکیاں اپنی پریشان زلفوں کے ساتھ ان کے اردگرد ناچ رہی ہیں۔

مَیں نے کسانوں کو دیکھا جو کھیتی کاٹنے میں مصروف ہیں۔ اُن کی عورتیں فصل اُٹھا اُٹھا کر لے جا رہی ہیں اور مسرت وخوشی کے گیت گانے میں مصروف ہیں۔

مَیں نے ایسی عورتوں کو دیکھا جو بھڑکیلے لباس کی جگہ چنبیلی کے پھول اناج اور سرسبز پتوں کا لباس زیب تن کئے ہوئے ہیں۔

مَیں نے انسان اور دوسری مخلوقات میں محبت کو استوار پایا۔ پرندوں کے جھنڈ بے خوف وخطر انسانوں کے قریب آتے ہیں۔ ہرنیوں کے غول اطمینان سے تالاب پر پانی پینے آتے ہیں۔

مَیں نے غریبی اور سرمایہ داری کی جگہ بھائی چارہ اور مساوات کا دور دورہ پایا۔

مَیں نے کسی ڈاکٹر کو نہیں دیکھا۔ اس لئے کہ ہر شخص اپنے تجربے اور سمجھ کی وجہ سے اپنا ڈاکٹر آپ ہے کسی نجومی کو بھی نہیں دیکھا اس لئے کہ ہر ایک کا اپنا ضمیر ہی سب سے بڑا نجومی ہے۔

مَیں نے محسوس کیا کہ انسان سمجھ گیا ہے کہ وہی مخلوقات کا محور ہے۔ اسی وجہ سے وُہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کمینہ حرکات سے دُور رہتا ہے۔ اس نے اپنے نفس کی بصیرت سے شک وشُبہ کے پردوں کو ہٹا دیا ہے۔ اس وجہ سے وُہ آسمان کی چادر پر بادل سے لکھے ہُوئے خط کو پڑھ لیتا ہے، پانی کی سطح پر نسیم سحری کے بکھرے موتیوں کو چُن لیتا ہے، کلیوں کی سرگوشیوں کو سمجھ لیتا ہے اور چشمے کے میٹھے سروں اور پانی کے بلبلوں سے پیدا شدہ

آواز کے معانی کو پہچان جاتا ہے۔

حاضر کی چار دیواری کے پیچھے ——— مستقبل کے سبزہ زار میں، میں نے جمال اور نفس کو نئے لباس میں دیکھ لیا اور ساری زندگی کو شبِ قدر پایا۔

ماضی کی بستی

حیات نے مجھے جوانی کے بلند پہاڑ کی سطح پر لا کھڑا کیا اور مجھے اشارہ کیا کہ اپنے پیچھے نظر ڈالوں میں نے اپنے پیچھے نگاہ ڈالی۔ مجھے ایک اجنبی شکل و صورت کا ایک شہر نظر آیا جو میدان کے اُس پار مرزاغ شکل میں کھڑا تھا مختلف خیالات اور رنگین بخارات اس میں چکر کاٹ رہے تھے لطیف سی کہر اس پر ایسی چھا رہی تھی جو اسے آنکھوں سے اوجھل کر رہی تھی۔

میں نے پوچھا! "اے حیات! یہ کیا ہے؟" اُس نے کہا "یہ ماضی

کی بستی ہے اس پر غور سے نظر ڈالو۔

مَیں نے غور سے دیکھا تو مجھے نظر آیا کہ —— اعمال نیند کی آغوش میں بڑے بڑے جابروں کی طرح بیٹھے ہیں۔ کلام کی مسجدیں نظر آئیں جن کے اردگرد روحیں مایوسی کی چیخ پکار اور اُمید کے گیت گانے میں مصروف تھیں۔ مذہب کے مجسمے نظر آئے جو کفر کی بنیادوں پر قائم تھے۔ لیکن شکوک و شبہات کی کثرت نے ان کی عمارت کو ڈھا دیا۔ افکار و خیالات کے بلند مینار سائل کے ہاتھ کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ میلانات کے راستے ایسے کشادہ دکھائی دے رہے تھے جیسے ٹیلوں میں سے گذرتا ہوا دریا۔ اسرار کے خزانے نظر آئے جن کی حفاظت تو ہوتی رہی لیکن جاسوسوں نے ان پر ہاتھ صاف کر لیا۔ اُونچے عزائم کے مضبوط برج دکھائی دیئے جو شجاعت کی بنیادوں پر قائم تھے لیکن خوف و ہراس نے ان میں شگاف ڈال دیئے۔ میٹھی خوابوں کے محل نظر آئے جو تاریک راتوں میں تو بہت خوبصورت دکھائی دے رہے تھے لیکن بیداری نے ان کے تمام حسن کو ملیامیٹ کر دیا۔ کمزوری کے چھوٹے چھوٹے ہائشی

جھونپڑے دیکھے، حقیقت و معرفت کی محفلیں دیکھیں جو عقل کے نور سے روشن تھیں لیکن جہل کی ظلمت نے ان کو تاریک بنا دیا۔ محبت کے شراب خانے نظر آئے جن میں عاشق مدہوش پڑے تھے لیکن خرد نے ان کی مستی کو فنا کر دیا۔

وہ ماضی کی بستی ہے جو دور بھی ہے اور قریب بھی —— نظر بھی آ رہی ہے اور نظر سے پوشیدہ بھی۔ اس کے بعد حیات میرے آگے آگے چلی اور کہا! "کھڑے کھڑے بہت دیر ہو گئی اب پیچھے چلے آؤ۔"

میں نے پوچھا! "اے روحِ حیات! کہاں جانا ہے؟"

اُس نے جواب دیا! "مستقبل کی بستی کی طرف۔"

میں نے کہا! "ذرا ٹھہر جاؤ۔ چلتے چلتے میں تھک گیا ہوں ٹیلوں میں میرے پاؤں زخمی ہو چکے ہیں اور گھاٹیوں میں چلتے چلتے میرے قویٰ جواب دے چکے ہیں۔"

اُس نے کہا! "چلتے رہو۔ ٹھیرنا بزدلی ہے اور ماضی کی بستی کو دیکھتے رہنا جہالت ہے۔"

کے ناقابل ہوتے ہوئے بھی اس کے دل کی تسکین کا سبب تھا

جب لوگوں کا شور و شر کم ہوا۔ راستے خالی ہو گئے۔ بیچاری ۔۔۔ نے بچے کو گود میں اُٹھایا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھا اور بڑے درد سے رونے لگی اور ایسی دردناک آواز سے جس کو سُن کر سخت چٹان بھی پگھل جاتے۔ کہنے لگی "میرے جگر کے ٹکڑے! تو عالم ارواح سے کیوں آیا؟ کیا میری تلخ زندگی کا حصہ دار بن کر؟ میری کمزوری پر رحم کھا کر؟ تو نے فرشتوں کی وسیع آبادی کو کیوں چھوڑا اور اس ذلت و بدبختی سے بھری ہوئی دُنیا میں کیوں قدم رکھا؟ میرے لال! میرے پاس آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیا تو دودھ کے بدلے آنسو پیئے گا؟ کیا میرے ننگے بازو تیرے لئے کپڑوں کا کام دے سکیں گے؟ جانوروں کے بچے گھاس پر گزارہ کر کے امن سے رات بسر کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پرندے دانے چگ کر درختوں کی شاخوں پر سوتے ہیں لیکن آہ! میرے کمسن بچے تجھے میری ٹھنڈی آہوں اور میری کمزوری کے سوا اور کوئی چیز میسر نہیں آسکتی۔"

اتنا کہہ کر اس نے بچے کو اس زور کے ساتھ سینے سے لگایا جس سے

معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان دونوں جسموں کو ایک کر دینا چاہتی ہے۔ آنکھیں اُوپر اُٹھا کر چیخنے لگی اور کہا۔ "اے میرے پروردگار! ہم پر رحم کر۔"

جب بادل چاند کے چہرے سے چھٹ گئے۔ اس وقت اس کی لطیف کرنیں اس شکستہ گھر کی کھڑکی سے اندر پہنچیں اور دو جسموں پر پڑنے لگیں جو سرد ہو چکے تھے........

زمانہ ـــــ اور ـــــ قوم

لبنان کی پہاڑیوں کے دامن میں' گھاٹیوں کے درمیان' چاندی کی سفید سلاخ کی طرح نظر آنے والی ندی کے کنارے کانٹوں کے درمیان اُگی ہوئی خشک گھاس کو چرنے والی کمزور اور دُبلی بھیڑوں کے گلے سے گھری ہوئی چرواہی بیٹھی ہے ـــــ ایک لڑکی جو دُور شفق کی طرف اس طرح غور سے دیکھ رہی ہے۔ جیسے وہ فضا کی سطح پر اپنی زندگی کے آئندہ واقعات کو ایک ایک کرکے پڑھ رہی ہے۔ آنسوؤں کی بوندیں اس کی گول گول آنکھوں میں یوں نظر آرہی تھیں جیسے نرگس میں شبنم کے قطرے۔ شدتِ غم سے اُس کا

مُنہ کھلا ہوا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی ٹھنڈی آہوں کے راستے اپنا دل باہر نکال دینا چاہتی ہے۔

شام کے وقت جب سایوں کی تاریکی آس پاس کے ٹیلوں پر پھیلنے لگی تو ایک بوڑھا کسان اس لڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے سفید بال اس کے سینے اور شانوں پر لٹک رہے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چمکدار درانتی تھی اور اس کی آواز موجوں سے اٹھتی ہوئی صدا کے مشابہ تھی اس نے کہا:۔

"ملکِ شام پر سلام ہو"

لڑکی کانپتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ خوفزدہ اور غمگین آواز میں اُسے مخاطب ہو کر کہنے لگی "اے زمانے! تو اب مجھ سے کیا چاہتا ہے"؟ پھر اپنی بھیڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی "مویشیوں کے ان گلوں میں سے صرف یہی کچھ باقی بچی ہیں جن سے یہ وادیاں بھر جاتی تھیں۔ کیا تو اب اور لینے آیا ہے"؟

یہی وہی چراگاہیں ہیں جو تیرے قدموں کی وجہ سے خشک ہو رہی ہیں۔ یہ کبھی وقت سرسبز وادیاں تھیں اور ہماری روزی کی مکمل ذمہ دار، میری بھیڑ بکریاں ان سبزہ زاروں میں چرا کرتی تھیں اور پاک و صاف دودھ دیا

کرتی تھیں۔ لیکن اب دیکھو۔ ان کے پیٹ خالی ہیں۔ وہ کانٹے توڑ رہی اور موت سے بچنے کی خاطر درختوں کی جڑوں پر گذر کر رہی ہیں۔

زمانے! خُدا سے ڈر۔ میرے سامنے نہ آ۔ تیرے مظالم کی یاد نے مجھے زندگی سے متنفر کر دیا ہے۔ تیری درانتی کی سختی کو دیکھ کر میں موت سے پیار کرنے لگی ہوں۔

مجھے تنہا ہی رہنے دے تاکہ مَیں اپنے آنسو شراب سمجھ کر پیوں، نے غم کو نسیم سحری سمجھوں اور زمانے! تو اس مغرب کی طرف چلا جا جہاں تو میں زندگی کی بہاریں دیکھ رہی ہیں۔ خوشی کی عیدیں منا رہی ہیں اور مجھے چھوڑ دے کہ تیری لائی ہوئی بدقسمتیوں کو رو رہی ہُوں۔"

بوڑھے نے درانتی کو کپڑوں میں چھپاتے ہُوئے مہربان باپ کی طرح اس کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا:۔

"شام کی سرزمین! مَیں نے تو صرف دی ہوئی نعمتوں کا ایک حصّہ تم سے واپس لیا ہے اور یقین رکھو کہ میں کسی کا حق چھیننے والا نہیں بلکہ چند دن کے لئے مستعار لے کر واپس لوٹا دیا کرتا ہُوں اور واپس کرتے

وقت اس حق میں معمولی سا نقصان بھی گوارا نہیں کرتا اور یقین رکھو کہ تمہاری
ہم عصر قوموں کو جو کچھ ملا ہے وُہ اس شرافت کی طفیل ہے جو کبھی تمہاری
غلام تھی۔ وُہ اس لیاقت کی وجہ سے ہے جو کبھی تمہارا تھا۔ مَیں اور انصاف
ایک ہی ذات کے دو چراغ ہیں۔ یہ میرے لئے مناسب نہیں کہ جو کچھ تمہیں
دیا تھا۔ وہی اب تمہاری ہم عصر قوموں کو نہ دُوں محبت کی تقسیم میرے
دربار میں انصاف سے ہوتی ہے میں اب تم دونوں سے یکساں محبت کیسے
کرُوں؟ شام کی سرزمین! تمہیں اپنی پڑوس کے ممالک مصر۔ ایران اور
یونان سے سبق لینا چاہئے۔ ان کے ریوڑ بھی ایسے ہی ہیں جیسے تمہارے
ہیں اور ان کی چراگاہیں بھی اسی طرح سوکھی ہیں جس طرح تمہاری۔ شام کی
سرزمین! جس حالت کا نام تم انحطاط رکھ رہی ہو۔ مَیں اسے غفلت سے
تعبیر کرتا ہُوں جس کے بعد یقیناً عمل اور خوشی کا دُور آنے والا ہے۔ کلی مرکر
ہی زندہ ہوتی ہے اور محبت جُدائی کے بعد ہی ترقی کرتی ہے۔"

بڑھا لڑکی کی طرف آگے بڑھا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا "اے پیغمبروں
کی بیٹی! مجھ سے ہاتھ ملا۔" لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ آنسوؤں کی آڑ
میں وُہ اس کی طرف دیکھتی رہی اور کہنے لگی! "زمانے رخصت"!

بوڑھے نے جواب دیا! "شام کی سرزمین! عنقریب پھر ملیں گے"
اسی وقت بوڑھا بجلی جیسی تیزی کے ساتھ چھپ گیا اور لڑکی
نے اپنے مویشی اکٹھے کرنے شروع کئے۔ وہ کہتی جا رہی تھی "تعجب ہے
گیا وہ عیشِ رفتہ واپس مل سکتا ہے؟"

اپنی اپنی بولی

تمہاری اپنی بولی ہے اور میری اپنی۔

زبان میں تمہارا حصّہ وہی ہے جو تم پسند کرتے ہو اور میرا حصّہ وُہ ہے

جو میرے افکار وخیالات کے موافق ہو۔

تمہارے لئے زبان کے الفاظ اور ان کی ترتیب ہے اور میرا حصّہ وہ

معانی ہیں جن کی طرف الفاظ اشارہ تو کرتے ہیں لیکن ان کو چھُو نہیں سکتے۔ ترتیب

ان کی طرف مائل تو ہوتی ہے لیکن وہاں اس کی رسائی نہیں ہوتی۔

تمہارے حصّے میں صرف ٹھنڈے بے جان لاشے ہیں، اور تمہارا خیال

ہے کہ وہی سب کچھ ہیں۔ میرے حصّے میں وُہ اجسام ہیں جن کی ذات کی کوئی قیمت نہیں۔ ساری قیمت ان ارواح کی ہے جو ان میں پوشیدہ ہے۔

تمہارے حصّے میں اس کا ایک خاص مقرّر معیار ہے اور میرے حصّے میں ہر وقت اس کی یہ حیثیت ہے کہ وُہ ایک واسطہ ہے جو بدلتا رہتا ہے اور اُسے میں اُس وقت تک کافی نہیں سمجھتا جب تک وُہ میرے دل کے بھیدوں کو دوسروں کے دل تک اور میری ضمیر کی آواز کو اوروں کی ضمیر تک نہ پہنچائے۔

تمہارے حصّے میں اس کے متعیّن قواعد اور محدود و خشک قوانین ہیں لیکن میرے حصّے میں وُہ نغمے ہیں جن کی سُروں کو مَیں بدل بدل کر اپنی فکر کی سُروں اور دل کے تاروں سے ملاتا رہتا ہُوں۔

تمہارے حصّے میں زبان کے لکھے ہُوئے لغات، ڈکشنریاں اور ضخیم کتابیں ہیں لیکن میرے حصّے میں کانوں سے چھنے ہوئے اور حافظے میں بیٹھے ہُوئے وُہ الفاظ ہیں جن سے لوگوں کے کان آشنا ہیں اور جن کو لوگ ہر خوشی اور غم کے موقع پر استعمال کرتے رہتے ہیں۔

تمہاری اپنی بولی ہے اور میری اپنی۔

تمہارے حصّے میں اس کا علمِ عروض، اس کے اوزان کی تفاعیل، قوافی اور اس کے جائز و ناجائز سے بھری ہوئی بحثیں ہیں اور میرے حصّے میں وہ چشمے ہیں جو سمندر کی طرف تیزی سے بہتے ہوئے گاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ سُر اس کا راستہ روکنے والی چٹانوں سے پیدا ہوتا ہے یا خزاں کے گرتے والے اُن پتّوں سے جو اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

تمہارے حصّے میں بڑے بڑے محقق، سودائی شاعر اور وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کے اشعار پر تضمین کی یا ان کے بند سے بند ملایا یا ان کے اشعار کی شرحیں لکھیں اور میرے حصّے میں وہ تخیلات ہیں جو اُن شاعروں کے دلوں میں ڈرتے ڈرتے چکر کاٹتے ہیں جنہوں نے نہ کبھی ایک شعر کہا اور نہ ایک سطر عبارت لکھی۔

تمہارے حصّے میں مرثیے۔ مدحیہ اور فخریہ قصائد اور تہنیت نامے ہیں لیکن میرا حصّہ وہ اشعار ہیں جو ماں کے پیٹ سے ہی مرے ہوئے نکلنے والے انسان کیلئے مرثیہ کے طور پر مستعمل نہیں ہو سکتے اور نہ مخمل اڑانے کے قابل انسانوں کی مدح کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں۔ وہ قابلِ رحم انسان کو مبارکباد دینے سے کتراتے ہیں۔ وہ ایسے شخص کی ہجو کرنے سے اپنے

آپ کو بلند تر سمجھتے ہیں جن سے آنکھیں بند کی جا سکتی ہیں وُہ فخر و غرور کو بُرا جانتے ہیں۔ اس لیے کہ انسان کے پاس اپنے عجز و جہل کے اقرار کے علاوہ کوئی فخر کے قابل چیز ہے ہی نہیں۔

تمہاری اپنی بولی ہے اور میری اپنی۔

تمہارے لئے تمہاری زبان کا علمِ بدیع، بیان اور منطق ہے اور میرے لئے کمزور کی آنکھوں کی ایک نگاہ۔ عاشق کے پلکوں میں جھلکتے ہُوئے آنسو۔ مومن کے ہونٹوں پر پھیلتی ہوئی مُسکراہٹ اور عالی ظرف فلسفی کے ہاتھ کا اشارہ ہے۔

تمہارے حصّے میں وُہ اقوال ہیں جو سیبویہ، اسود، ابنِ عقیل[1] اور ان جیسے تنگدل اور زود رنج لوگوں کی زبان سے نکلے۔ میرے حصّے میں پیار کے وُہ جُملے ہیں جن سے ماں اپنے بچّے کو، عاشق اپنے محبوب کو اور زاہدِ شب زندہ دار، رات کے سکون کو مخاطب کرے۔

تمہارے حصّے میں "رکیک" الفاظ کے بدلے "فصیح" اور مبتذل الفاظ کی جگہ بلیغ الفاظ ہیں اور میرے حصّے میں وُہ الفاظ ہیں جو وحشت زدہ انسان کی زبان سے رُک رُک کر نکلتے ہیں۔ دردناک انسان کے گلے سے بڑی مشکل

---

[1] یہ عربی زبان کے علم صرف و نحو کے مشہور اُستاد ہیں۔

سے باہر آتے ہیں اور جو قیدی کی زبان پر جاری ہوتے ہیں اور یہ سب کے سب میری نظر میں فصیح و بلیغ ہیں۔

تمہارے حصے میں زبان کی مضبوط بنیادیں ہیں لیکن میرے حصے میں کوئل اور بلبل کے چہچہے ہیں جو خیال کے کھیتوں اور سبزہ زاروں میں اِدھر اُدھر اڑتی پھرتی ہیں۔

تمہارے حصے میں چاندی کے بنے ہوئے برتن ہیں لیکن میرے حصے میں بارش کی پھوار، بازگشت صدائیں اور بید و سفیدہ کی ٹہنیوں سے کھیلنے والی ٹھنڈی نسیم سحر ہے۔

تمہارے حصے میں ترصیع، تنزیل، تمین اور خدا معلوم اور کیا کیا تفعیل بلائیں ہیں لیکن میرے حصے میں وہ سادہ کلام ہے کہ منہ سے نکلتے ہی سننے والا اس کی تہ تک پہنچ جاتا ہے اور جب لکھا جاتا ہے تو لکھنے کے ساتھ ہی پڑھنے والے کو غیر محدود فضائیں نظر آنے لگ جاتی ہیں۔

تمہارے حصے میں زبان کی ماضی اور ماضی کے شاندار کارنامے اور مفاخر ہیں لیکن میرے حصے میں اس کا حال اور مستقبل ہے وہ حال جو مستقبل کی تیاری میں مصروف ہے اور وہ مستقبل جو اس کی آزادی اور استقلال

کا ضامن ہے۔

تمہاری اپنی بولی ہے اور میری اپنی۔

تمہاری بولی سے تمہارے حصّے میں وُہ مغنّی ہے جو تمہارے لئے ہاتھ میں ستار لے کر اس کے تاروں کو چھیڑتا ہے اور اس کی سخت انگلیاں اس سے اپنے پسند کے نغمے نکالتی ہیں۔ میری بولی سے میرے حصّے میں ایسی سارنگی آئی ہے جس کو ہاتھ میں لے کر اس سے ایسے راگ نکالتا ہُوں جس سے میری رُوح خواب جیسا نشہ محسوس کرتی ہے اور میری انگلیاں ان تاروں کو اور زیادہ چھیڑتی ہیں۔

تمہارے حصّے میں بس اتنا ہی ہے کہ اپنی اپنی بولی کو ایک دوسرے کے کانوں تک پہنچاؤ اور صرف آپس ہی میں خوشی محسوس کر کے ایک دوسرے کی تعریفیں کرنے لگ جاؤ لیکن میرے حصّے میں وُہ میٹھی بولی ہے جسے میں صرف ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں تک پہنچاتا ہُوں اس لئے کہ ہوا کے کان تمہارے کانوں سے زیادہ اس بولی کو سُننے کی قابلیّت رکھتے ہیں اور سمندر کا دل تمہارے دلوں کی بہ نسبت زیادہ جگہ دیتا ہے۔

تمہارے حصّے میں یہی ہے کہ اپنی بولی کے بوسیدہ لباس کے گرے پڑے چیتھڑے اُٹھا اُٹھا کر جمع کر لیا کرو لیکن میں ہر پرانے اور بوسیدہ لباس کے اپنے ہاتھوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کرتا ہُوں اور پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کی راہ میں جو چیز بھی حائل ہوتی ہے میں اس کو راستے کے دونوں جانب پھینک دیا کرتا ہوں۔

تمہارے حصّے میں یہی ہے کہ اپنی بولی کے بیکار اعضا کی حفاظت کرتے رہو اور ان کو اپنی عقل میں محفوظ کر لیا کرو لیکن میرا کام یہ ہے کہ میں ہر مُردہ عضو اور شل حصّے کو آگ سے جلا دیا کرتا ہوں۔

تمہاری بولی اپنی ہے اور میری اپنی۔

تمہارے حصّے میں تمہاری بوڑھی اور لولی لنگڑی زبان ہے اور میرے حصّے میں حسین خوابوں کے سمندر میں تیرنے والی نوجوان دوشیزہ جیسی بولی ہے مجھے بتاؤ! کہ تمہاری اپاہج اور میری نوجوان بولی سے پردے اُٹھا دیئے جائیں تو ان کا انجام کیا ہوگا؟

مَیں بتاؤں!

تمہاری بولی کی کوئی حقیقت نہیں رہیگی۔

جس دیئے کا تیل ختم ہو چکا ہو وہ زیادہ دیر تک جلنے کے قابل نہیں

آگے بڑھتی ہوئی زندگی اپنے پیچھے رُخ نہیں پھیرا کرتی۔

تابوت کی لکڑیوں میں کبھی پھول نہیں کھل سکتے اور نہ ان میں پھل لگ سکتا ہے۔

جسے تم "بیان" کہتے ہو اس کی حقیقت زرکشی کئے ہوئے بانجھ پن اور کلس لگائی ہوئی وکالت کے سوا کچھ نہیں۔

تمہارے دلوں کی گرمی تمہیں الفاظ کی معمولی معمولی سوتوں کی طرف با دلِ ناخواستہ دوڑائیگی۔

تمہارے دلوں کی سختی تمہیں اپنی زبانوں کی نرمی پر مجبور کریگی اور تمہارے خیالات کی حقارت تمہیں غلام بنا کر دیگی۔

یہ صدی گذرنے نہیں پائیگی کہ تمہاری ہی اولادوں سے تمہارے قاتل اور جلّاد پیدا ہونگے۔

شاعر ایک پیغامبر ہے جو روحِ کل کا پیغام ایک ایک روح تک پہنچاتا ہے اگر کسی میں پیغام پہنچانے کا یہ وصف موجود نہیں تو یقین رکھو کہ

وُہ شاعر بھی نہیں۔

ادیب سچّی باتیں بتانے والا انسان ہے —— اگر کسی کے پاس کوئی سچّی اور واقعیت پر مبنی بات نہیں تو وُہ ادیب ہی نہیں۔

مَیں کہتا ہوں کہ نظم و نثر فکر اور جذبات کا دوسرا نام ہے اس کے علاوہ جو بھی ہے۔ اس کی حقیقت کچّے دھاگے اور دانہ دانہ ہونے والی لڑی سے زیادہ نہیں۔

اور اب جب حقیقت کی صبح طلوع ہو چکی ہے --- اب بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ مَیں تمہاری بولی کی شکایت اس لئے کرتا ہوں کہ اپنی زبان کی فوقیت ثابت کروں ؟ نہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے مجھے تمہاری آنکھوں اور ناک کے لئے آگ اور دھواں بنایا ہے کبھی نہیں۔

زندگی کبھی موت کے سامنے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتی حقیقت کبھی اپنی ذات کی تشریح

"coming generation of ... not believe that a man was in their country who sings the songs of Love and Freedom."

باطل کے سامنے نہیں گرتی۔ قوت بھی ضعف کے سامنے خوفزدہ نہیں ہوتی۔

تمہاری اپنی بولی ہے اور میری اپنی۔

Khalil Gibran was born in Lebnon in Bashri. The year of his birth was 1883, and he died in 1931. He was a lover of Arabic literature, he was proud of his orientalist. He was a great philosopher, a great friend of the poor, and the enemy of capitalists. His other books are 'The prophet' 'Sand and Foam' 'The Forerunner' 'Jesus the son of man' 'Spirits Rebellious' 'The Madman' 'Tears and Smile'

In his the in the Slaveman ever "

"Khalid was a great man of world"

"How Gibran died? Why the death not come to death?"